قرآن کریم اور سُنّت نبویہ علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام کی تعلیمات کا علمبردار

بینات

جلد: ۸۱ شمارہ: ۵

جمادی الاولیٰ: ۱۴۳۹ھ - فروری: ۲۰۱۸ء

قیمت فی شمارہ: ۳۵ روپے، زرِ سالانہ: ۴۰۰ روپے

مدیر / مدیر مسئول

مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر

نائب مدیر

مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

مدیر معاون

مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ

ناظم

مولانا فضل حق یوسفی

خط وکتابت اور ترسیل زر کا پتہ

دفتر ماہنامہ ''بینات'' جامعۃ العلوم الاسلامیۃ علامہ بنوری ٹاؤن

کراچی، پوسٹ کوڈ: 74800 پوسٹ بکس نمبر: 3465

فون دفتر ''بینات'': 021-34927233

اکاؤنٹ نمبر

اکاؤنٹ نمبر: 7-397-101900 برانچ کوڈ: 0816

مسلم کمرشل بینک علامہ بنوری ٹاؤن برانچ کراچی

بیرون ملک سے بذریعہ ہوائی ڈاک

ریاست ہائے متحدہ امریکہ، جنوبی افریقہ، تھائی لینڈ، ناروے، ویسٹ انڈیز وغیرہ: 35 امریکی ڈالر

سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، مسقط، بحرین، عمان، ایران، انڈیا وغیرہ: 27 امریکی ڈالر

بنگلہ دیش: 25 امریکی ڈالر

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ

علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن

فون: Ext. 146 - 147 34121152 - 34123366 - 34913570

فیکس: +92-21-34919531

Web: www.banuri.edu.pk ***Email***: bayyinat@banuri.edu.pk

ناشر: مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر **مطبع:** ایجوکیشنل پریس **طابع:** فیروز زکی

فہرستِ مضامین

بصائر وعبر

انتہاء پسندی کی روک تھام!
تعلیماتِ نبویہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کی روشنی میں — ۳ — ادارہ

مقالات ومضامین

مروجہ سن عیسوی میں کیا کیا اصلاحیں ہوئیں؟! — ۹ — حضرت مولانا محمد عبدالرشید نعمانیؒ

مکاتیب علامہ کوثریؒ... بنام... علامہ بنوریؒ (قسط:۱۱) — ۱۶ — ترجمہ: مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

سفرِ ترکی کے چند مشاہداتی تأثرات!! — ۲۰ — حضرت مولانا فضل محمد یوسف زئی

اسلام میں خیرخواہی کی تاکید! — ۲۸ — مفتی غلام مصطفیٰ رفیق

تاریخِ اسلامی میں دروغ گوراویوں کا کردار! — ۳۱ — مفتی ابوالخیر عارف محمود

''شَرَائِعُ مَنْ قَبْلَنَا'' اور اُن کا حکم (قسط:۵) — ۵۰ — مولانا انعام اللہ

یادِ رفتگاں

حضرت مولانا محمد اسلم قاسمیؒ — ۵۵ — مفتی محمد صادق حسین قاسمی

دار الافتاء

قربانی، عقیقہ اور صدقہ کے جانوروں میں فرق! — ۵۹ — ادارہ

نقد ونظر

۶۳ — ادارہ

انتہاء پسندی کی روک تھام

تعلیماتِ نبویہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کی روشنی میں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ وسلامٌ علٰی عبادہٖ الذین اصطفٰی

حضرت مولانا امداد اللہ صاحب دامت برکاتہم (ناظم تعلیمات جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن اور رکن اسلامی نظریاتی کونسل) نے یہ مقالہ مؤرخہ ۷؍دسمبر ۲۰۱۷ء کو اوقاف، مذہبی امور اور زکوٰۃ وعشر ڈِپارٹمنٹ (حکومتِ سندھ) کی جانب سے منعقدہ ''صوبائی سیرت النبی ؐکانفرنس'' میں پیش کیا۔ موضوع کی اہمیت اور حساسیت کے پیشِ نظر افادۂ قارئین کے لیے بطور ''بصائر وعبر'' پیشِ خدمت ہے۔ (ادارہ)

معزز مہمانانِ گرامی اور محترم حاضرین! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

انتہاء پسندی کے سلسلے میں اسلامی تعلیمات کیا ہیں؟ نبی کریم ﷺ نے اس بارے میں اپنی اُمت کو کیا تعلیمات ارشاد فرمائی ہیں؟ اس پر کچھ عرض کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انتہاء پسندی کی تعریف اور اس کی حدود واربعہ پر کچھ بات کی جائے۔

انتہاء پسند (جسے انگریزی میں ''Extremist'' کہتے ہیں) لغت میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی کام یا چیز کی انتہاء چاہتا ہو، یہ اعتدال پسند ''Moderate'' کی ضد ہے، لفظ کے ظاہر سے اس کا مفہوم ومعنی بہت وسیع ہے، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں یہ لفظ صرف مذہب کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے، حالاں کہ اس لفظ کے دامن میں مذہب، سیاست، معاشرت، اخلاق، عقائد واعتقادات اور کئی دیگر شعبے بھی آسکتے ہیں۔

ہمیں ان اسباب اور وجوہات پر غور کرنا چاہیے جو انتہاء پسندی کا باعث بنتی ہیں، کوئی بھی انسانی اور اسلامی معاشرہ ایک خاندان کی طرح ہوتا ہے، جس کے افراد ایک دوسرے سے باہمی تعاون، تحمل و برداشت اور بھائی چارے کی بنیاد پر منسلک ہوتے ہیں۔ جب کسی معاشرے میں طبقاتی تقسیم شروع ہوجائے، معاشی عدم مساوات عام ہوجائے اور ذاتی مفادات کی خاطر ملی وقومی مفادات کو پامال کیا جانے لگے تو نتیجتاً انتہاء پسندی کی وبا پھیلتی ہے۔ آج دنیا میں انتہاء پسندی کا لفظ زبان زدِ عام وخاص ہوچکا ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ جو طاقتیں اس انتہاء پسندی کے حوالے سے زیادہ غیر معمولی حساسیت کا مظاہرہ کررہی ہیں، انہی طاقتوں کی غیر مساویانہ بلکہ میں صاف کہوں گا کہ انتہاء پسندانہ پالیسیوں نے دنیا کو تباہی کے دَہانے تک لا کھڑا کیا ہے۔ آج چوں کہ ''میڈیا وار'' اور ''ڈپلومیسی'' کا دور دورہ ہے، اب میدانوں سے زیادہ دیگر محاذوں پر جنگیں لڑی جارہی ہیں، اس لیے اسلام دشمن قوتیں اپنے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کے لیے الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا کا سہارا لے کر سارا ملبا مظلوم مسلمانوں پر ڈال دیتی ہیں۔

حالاں کہ یہ حقیقت ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے لائے ہوئے دین اور نظام کا مقصد پوری انسانیت کی فلاح اور ترقی تھا، آپ ﷺ نے اسلامی معاشرے کو ایک ایسی عمارت سے تشبیہ دی ہے جس کا ہر حصہ باقی اجزاء کو سہارا دیتا ہے اور مسلمانوں کو ایک جسم کی مانند قرار دیا ہے، جس کا ہر عضو دوسرے اعضاء کی تکلیف کو محسوس کرتا اور اُسے دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔

چوں کہ فرقہ بندی، علاقائیت، قومیت، صوبائیت اور لسانیت کی سوچ سے ایک اسلامی معاشرے کو بے حد نقصان پہنچتا ہے، اور اغیار کی بھی یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اس طرح کے باہمی اختلافات پیدا کرکے مسلمانوں میں انتشار پھیلائیں۔ تعلیماتِ نبویہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) نے ان سارے راستوں کو بند کردیا ہے جن سے انتہاء پسندانہ سوچ جنم لیتی ہے۔ حکمرانوں کی اطاعت اور مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ جڑے رہنے کے سلسلے میں ارشاداتِ نبویہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) مشعلِ راہ ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے تعصب پسندی کی حوصلہ شکنی فرمائی، مسلمانوں اور مسلمانوں کے ملکوں میں رہنے والی اقلیتوں کے قتل و قتال میں ملوث لوگوں کے لیے انتہائی سخت الفاظ بیان فرمائے، چنانچہ ارشادِ نبوی ہے:

''عن أبي قيس بن رياح عن أبي هريرةؓ عن النبي – صلى الله عليه وسلم – أنهٗ قال: من خرج من الطاعة وفارق الجماعة فمات، مات ميتةً جاهليةً، ومن قاتل تحت رأية عمية يغضب لعصبية أو يدعو إلىٰ عصبية أو ينصر عصبية، فقتل فقتلة جاهلية ومن خرج علىٰ أمتي يضرب برها وفاجرها ولا يتحاش من مؤمنها ولا يفي لذي عهد عهدهٗ فليس مني ولست منه۔''

(صحیح مسلم، کتاب الإمارۃ، باب الأمر بلزوم الجماعۃ عند ظہور الفتن، ج:۶، ص:۲۰، ط: دار الجیل)

''نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ: جو شخص حکمرانِ وقت کی اطاعت سے باہر نکل آئے اور مسلمانوں کی جماعت سے علیحدہ ہوا اور اسی حالت میں اُسے موت آئے تو یہ شخص جاہلیت کی

موت مرا۔ جو شخص عصبیت کی خاطر اندھا دھند کسی کے جھنڈے تلے لڑے، عصبیت کی طرف بلائے یا عصبیت کے لیے معاون بنے اور اس دوران وہ قتل ہوجائے تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہے۔ جو شخص میری اُمت کے خلاف برسرِ پیکار نکلے، نیک و بد کی تمیز کیے بغیر ہر شخص کو قتل کرتا پھرے، کسی مؤمن سے اپنی تلوار کو نہ بچائے اور نہ ہی کسی ذمی کے عہد کو پورا کرے تو نہ اُس کا مجھ سے کوئی تعلق اور نہ میرا اُس سے کوئی تعلق ہے۔‘‘

اسلام کی اعتدال پسندی یہ ہے کہ وہ اپنی جان و مال، دین و وطن کے دفاع اور تحفظ کے لیے سینہ سپر رہنے کی تلقین بھی کرتا ہے اور یہ بھی چاہتا ہے کہ کسی فرد یا قوم سے کسی دوسرے فرد یا قوم کو بلاقصور کوئی تکلیف نہ پہنچے، اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری آسمانی دین کو جن بے شمار خصوصیات اور امتیازات سے نوازا اُن میں ایک وصفِ خاص اور ایک طرّۂ امتیاز یہ ہے کہ اس کا ہر حکم معتدل اور متوسط ہے اور اِفراط و تفریط سے پاک ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

’’وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا ۔‘‘ (البقرۃ:۱۴۳)

’’اور اسی طرح ہم نے تم کو متوسط اور معتدل اُمت بنایا ہے۔‘‘

وسط اور اعتدال دونوں کا مفہوم تقریباً ایک ہی ہے۔ لغت کی تصریحات کے مطابق اعتدال اور توسط کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ کسی چیز کے دو متضاد اور بالمقابل پہلوؤں کے درمیان کا حصہ اس طرح اختیار کیا جائے کہ ان دونوں پہلوؤں میں سے ہر ایک دوسرے پر غالب نہ آئے اور کسی بھی مرحلے میں افراط یا تفریط کا احساس نہ ہو۔ اسلام کا یہ وصفِ اعتدال ہمیں تمام تعلیمات میں نظر آتا ہے، خواہ وہ تعلیمات عملی ہوں یا اعتقادی، خواہ اُن کا تعلق عبادات سے ہو یا معاشرت سے، ہر معاملے میں اسلام یہی کہتا ہے کہ اعتدال اور میانہ روی اختیار کرو۔

گزشتہ اُمتیں عقائد کے باب میں ہمیں دو انتہاؤں پر نظر آتی ہیں: بعض اُمتوں نے اپنے نبی کے بالکل واضح اور روشن معجزات دیکھنے کے باوجود اُن کا انکار کیا، دوسری طرف کچھ اُمتیں وہ تھیں جنھوں نے اپنے پیغمبر کو اللہ کا بیٹا بنادیا۔ اُمتِ مسلمہ کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اپنے نبی کریم ﷺ پر نہ صرف کامل ایمان لاتی ہے، بلکہ اُن کے لیے اپنی جان، مال، عزت وآبرو لٹانے پر تیار ہے، لیکن دوسری طرف اللہ کو اللہ اور اپنے رسول کو رسول مانتی ہے۔

عمل کے باب میں تمام اُمتوں کے احوال پر نظر ڈالی جائے تو صرف اُمتِ محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) ہی جادۂ اعتدال پر کھڑی نظر آتی ہے۔ باقی اُمتوں کا حال یہ ہے کہ ایک طرف تو ان اُمتوں کے کچھ لوگ آسمانی شریعت کے خلاف صف آراء نظر آتے ہیں، یہاں تک کہ انجیل اور تورات جیسی آسمانی کتابوں کے احکام میں بھی وہ چند سکوں کے عوض تبدیلی کرنے سے گریز نہیں کرتے، دوسری طرف کچھ

لوگ ایسے نظر آتے ہیں جن کی نظر میں شریعت کی اتباع اور ترکِ دنیا دونوں لازم وملزوم ہیں۔

اسلام عبادت کی تلقین تو کرتا ہے، لیکن نہ اس قدر کہ آدمی عبادت کی خاطر سب کچھ چھوڑ بیٹھے، اس سلسلے میں وہ مشہور واقعہ پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے باہم طے کیا، ایک نے کہا کہ: میں دن میں مسلسل روزے رکھوں گا۔ دوسرے نے کہا کہ: میں رات کو لگاتار نمازیں پڑھوں گا۔ تیسرے نے کہا کہ: میں نکاح نہیں کروں گا۔ سرکارِ دوعالم ﷺ کو معلوم ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: میں روزے بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، میں رات کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور آرام بھی کرتا ہوں اور میں نے نکاح بھی کیے اور میں تم میں سے سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں، اس ارشادِ مبارک کا منشأ یہی ہے کہ اسلام کو ہر معاملے میں اعتدال مطلوب ہے، آپ روزہ بھی رکھیں اور افطار کرکے اپنے جسم کو پاکیزہ وحلال غذاؤں سے لطف اندوز ہونے کا موقع بھی فراہم کریں، آپ نمازیں بھی پڑھیں، لیکن نیند کے ذریعے اپنے بدن کو آرام بھی دیں:

''حدثنا سعيد بن أبي مريم ، أخبرنا محمد بن جعفر ، أخبرنا حميد بن أبي حميد الطويل أنه سمع أنس بن مالك – رضي اللّٰه عنه – يقول: جاء ثلاثة رهط إلٰى بيوت أزواج النبي صلى اللّٰه عليه وسلم يسألون عن عبادة النبي صلى اللّٰه عليه وسلم فلما أخبروا كأنهم تقالوها، فقالوا: وأين نحن من النبي صلى اللّٰه عليه وسلم، قد غفر لهٗ ماتقدم من ذنبه وما تأخر . قال أحدهم: أما أنا فإني أصلي الليل أبدا وقال آخر: أنا أصوم الدهر ، ولا أفطر وقال آخر: أنا أعتزل النساء ، فلا أتزوج أبدا ، فجاء رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فقال : أنتم الذين قلتم كذا وكذا ؟ أما واللّٰه ! إني لأخشاكم للّٰه وأتقاكم لهٗ ، لكني أصوم وأفطر وأصلي وأرقد وأتزوج النساء ، فمن رغب عن سنتي فليس مني۔'' (صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب الترغیب فی النکاح، ج:۷،ص:۲، ط: دار الشعب)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تین افراد نبی کریم ﷺ کی عبادت کی بابت استفسار کے لیے نبی کریم ﷺ کی ازواج کے پاس تشریف لائے، جب اُنہیں نبی کریم ﷺ کی عبادت کے متعلق بتلایا گیا تو انہوں نے اسے کم سمجھتے ہوئے کہا کہ: کہاں ہم اور کہاں نبی اکرم ﷺ ؟! ان کے تو اگلے پچھلے تمام گناہ معاف ہوچکے ہیں، ان میں سے ایک نے کہا کہ: میں پوری زندگی ساری رات نماز پڑھتا رہوں گا۔ دوسرے نے کہا کہ: میں ساری عمر روزہ رکھوں گا۔ تیسرا بولا کہ: میں عورتوں سے دور رہوں گا، کبھی نکاح نہیں کروں گا۔ نبی کریم ﷺ تشریف لائے اور فرمایا کہ: تم لوگوں نے یہ یہ باتیں کہی ہیں؟! بخدا! میں تم لوگوں سے زیادہ خدا کا خوف اور تقویٰ رکھتا ہوں، لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں، افطار بھی کرتا ہوں، راتوں کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور نیند بھی کرتا ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، (یہ میرا طریقہ ہے) جو شخص میری سنت اور طریقے سے منہ موڑے گا، اس کا مجھ سے کچھ لینا دینا نہیں۔''

معاشرتی اعتدال کا نمونہ دیکھنا ہو تو اقلیتوں کے تحفظ کے سلسلے میں اسلامی تعلیمات کو دیکھ لیا جائے کہ اسلام اُنہیں کیا حقوق فراہم کرتا ہے:

’’حدثنا سليمان بن داود المهري ، أخبرنا ابن وهب ، حدثني أبو صخر المديني ، أن صفوان بن سليم ، أخبرهُ عن عدة من أبناء أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم ، عن آبائهم دنية عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال : ألا من ظلم معاهدا ، أو انتقصهُ ، أو كلفهُ فوق طاقته ، أو أخذ منه شيئًا بغير طيب نفس ، فأنا حجيجهُ يوم القيامة ۔‘‘ (سنن أبی داود، کتاب الجہاد، ج:۳،ص:۱۷۰، ط: دار الفکر)

’’نبی کریم ﷺ نے فرمایا: خوب سن لو! جو شخص مسلمانوں کے ملک میں رہنے والے کسی معاہد اور ذمی پر ظلم کرے، اس کی توہین کرے، اسے اس کی وسعت اور طاقت سے زیادہ کا مکلّف بنائے یا اس سے کوئی چیز اس کی رضامندی کے بغیر لے گا تو میں قیامت کے دن اس غیرمسلم کے ساتھ ہو کر اس مسلمان سے حق کا مطالبہ کروں گا۔‘‘

جنگ کے جذباتی ماحول میں، جہاں ایک دوسرے کے خلاف انتہائی قدم اُٹھانے سے کوئی دریغ نہیں کرتا، وہاں بھی اسلام نے اپنے ماننے والوں کو اعتدال کی راہ دکھائی ہے، چنانچہ مجاہدینِ اسلام کے لیے جنگ کے آداب وضع کیے گئے، حکم دیا گیا کہ کسی بوڑھے، عورت اور بچے کو قتل نہ کرو، انسانیت کی توقیر واحترام کا درس دیا گیا کہ قتل ہونے کے بعد اپنے جانی دشمن کے اعضاء نہ کاٹو:

’’عن خالد بن الفزر ، حدثني أنسؓ بن مالک ، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال : انطلقوا باسم الله وبالله وعلى ملة رسول الله ، ولا تقتلوا شيخًا فانيًا ولا طفلا ولا صغيراً ولا امرأةً ، ولا تغلوا ، وضموا غنائمكم ، وأصلحوا وأحسنوا إن الله يحب المحسنين ۔‘‘ (سنن أبی داود، کتاب الجہاد، ج:۳،ص:۳۷، ط: دار الفکر)

’’حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: آپ ﷺ نے مجاہدینِ اسلام کو احکام دیتے ہوئے فرمایا کہ: اللہ کا نام لے کر اللہ پر بھروسہ کرکے اور اُس کے رسول ﷺ کے طریقے پر عمل کرتے ہوئے جاؤ، بوڑھے ضعیف شخص، بچے اور عورت کو قتل مت کرنا، مالِ غنیمت میں خیانت نہ کرنا، (بلکہ) مالِ غنیمت کو اِکھٹے رکھنا، اصلاح کرنا اور نیک کام کرنا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کو پسند کرتے ہیں۔‘‘

’’ثم أمر النبي صلى الله عليه و سلم بلالا أن يدفع إليه اللواءَ فحمد اللهَ و صلى على النبي صلى الله عليه و سلم ، ثم قال : خذ ابن عوف فاغزوا جميعا في سبيل الله ، فقاتلوا من كفر بالله، لا تغلوا و لا تغدروا و لا تمثلوا و لا تقتلوا وليدا، فهذا عهد الله و سيرة نبيه صلى الله عليه و سلم ۔‘‘ (المستدرک علی الصحیحین، ج:۴،ص:۵۸۲، ط: دار الکتب العلمیۃ)

’’نبی کریم ﷺ نے (حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو ایک لشکر پر بھیجتے وقت) حضرت

بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اُنہیں جھنڈا دے دو، پھر آپ ﷺ نے اللہ کی حمد و ثنا بیان کرنے کے بعد حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ: یہ جھنڈا لو اور سب اللہ تعالیٰ کے راستے میں جا کر اللہ تعالیٰ کا انکار کرنے والوں سے لڑو، مالِ غنیمت میں خیانت مت کرنا، دھوکہ مت دینا، کسی مقتول کا مثلہ نہیں کرنا (ناک کان مت کاٹنا)، کسی بچے کو قتل نہیں کرنا، یہی اللہ کا عہد اور اُس کے نبی ﷺ کی سیرت اور طریقہ ہے۔''

فتنہ وفساد اور قتل ناحق کے بارے میں اسلام سے زیادہ کسی مذہب نے اس کی مذمت نہیں کی۔ اسلام سراپا امن والا مذہب ہے، اسلام ہر طرف امن وسلامتی دیکھنا چاہتا ہے۔ اسلام سے زیادہ افہام وتفہیم کا قائل کوئی دوسرا مذہب نہیں ہے۔ اسلام میں نہ جبر واکراہ ہے، نہ ظلم وزیادتی ہے، نہ حق تلفی اور ناانصافی ہے، بلکہ ہر معاملے میں اس کا رویہّ مصالحت آمیز اور رواداری ہے۔

انتہاء پسندی کی روک تھام کے لیے ریاست پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ:

۱:- ریاست ایسا ماحول فراہم کرے کہ مسلمان باہم اُخوت وبھائی چارہ کو فروغ دیں، اور آپس کے ٹکراؤ اور اختلاف وانتشار کے تمام اسباب سے دور رہیں۔

۲:- سادگی کو فروغ دیں، اس لیے کہ سادگی اسلامی معاشرے ہی کی نہیں، بلکہ ہر معقول معاشرے کی ضرورت ہے۔

۳:- اسراف اور فضول خرچی سے اجتناب کریں، کیوں کہ اسراف سے صرف تکبر اور سرکشی ہی پیدا نہیں ہوتی، بلکہ اس سے معاشرے میں طبقاتی منافرت اور انتہاء پسندانہ رویہ بھی پیدا ہوتا ہے جو معاشرتی زندگی کے لیے زہرِ قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔

۴:- ریاست پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ایک ایسا معاشی وسماجی نظام یقینی بنایا جائے جہاں غریب، غریب تر اور امیر، امیر تر نہ ہو اور رزقِ حلال کمانے کے مواقع سب کو مساوی طور پر میسر ہوں۔

۵:- ریاست کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ امن واَمان کی صورتِ حال کو بہتر بنائے، بدامنی کی بنا پر جانوں کے عدم تحفظ کا احساس بھی انتہاء پسندانہ سوچ پیدا کرتا ہے۔

۶:- مسلم حکومتیں، ریاستی اور عالمی سطح پر اسلام کے متعلق اسلام دشمنوں کا پھیلایا ہوا منفی تأثر دور کرنے کے لیے اپنے وسائل استعمال کریں اور عالمی پلیٹ فارموں پر بلاجھجک کھل کر اسلام اور مسلمانوں کا موقف پیش کریں، اور مسلمانوں کے دامن پر لگائے گئے بے جا الزامات کا مقدمہ لڑیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو پیغمبرِ اسلام کی تعلیمات پر صحیح معنوں میں عمل کی توفیق عطا فرمائے، آمین!

وصلی اللّٰہ تعالٰی علٰی خیر خلقہٖ سیدنا محمد وعلٰی آلہٖ وصحبہٖ أجمعین

..... ۞ ..... ۞ ..... ۞ .....

مروجہ سنِ عیسوی میں کیا کیا اِصلاحیں ہوئیں؟!

حضرت مولانا محمد عبدالرشید نعمانی رحمۃ اللہ علیہ، سابق مدیر ماہنامہ بینات، واستاذ حدیث جامعہ

موجودہ سن عیسوی دراصل رومی سن ہے، جس کے بیشتر مہینوں کے نام مختلف رومی دیویوں اور دیوتاؤں کے ناموں سے لیے گئے ہیں اور یہ دیکھ کر سخت افسوس ہوتا ہے کہ ایک جداگانہ نظامِ تقویم کے حامل ہونے کے باوجود ہم لوگ اپنی روزمرہ تحریروں میں ایسے مہینوں کا عام استعمال کرتے ہیں جو افسانوی قسم کے باطل دیوتاؤں کی طرف منسوب ہیں، حسبِ تصریح جوہری طنطاویؒ اُن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

مہینہ کا نام	وجہ تسمیہ
جنوری	یہ جانوس سے ماخوذ ہے، جانوس ایک دیوتا کا نام ہے، رومی لوگ اس کے آگے پیچھے دو چہرے بناتے تھے جس سے (وہ یہ خیال پیش کرتے تھے کہ) وہ سامنے اور پیچھے دونوں جانب دیکھتا تھا۔
فروری	یہ نام فبروا نامی ایک دیوی سے ماخوذ ہے، جسے اہل روم کے ہاں طہارت کی دیوی کا مقام حاصل ہے۔
مارچ	یہ مارس سے ماخوذ ہے، جو رومیوں کے نزدیک جنگ کا دیوتا ہے۔
اپریل	یہ نام ابیریری کے لفظ سے ماخوذ ہے جس کے معنی رومی میں کسی چیز کے پھوٹنے یا کھلنے کے ہوتے ہیں، اس مہینے کا یہ نام اس مناسبت سے تجویز کیا گیا کہ اس میں پھول کھلتے ہیں۔
مئی	میا سے ماخوذ ہے جو افسانوی شیطان اٹلس کی بیٹیوں میں سے ایک کا نام ہے۔
جون	یہ نام یونون سے ماخوذ ہے جو دیویوں کے سردار جیوپڑ کی بیوی تھی۔

جولائی	جولیانی تقویم کے بانی جولیس قیصر کی یادگار کے طور پر اس مہینے کا نام ''جولائی'' رکھ دیا گیا۔
اگست	رومیوں کے پہلے بادشاہ اور جولیس قیصر کے جانشین اغسطس کی یادگار کے طور پر اس مہینے کا نام ''اگست'' رکھ دیا گیا۔
ستمبر	اس کے معنی ہیں ''ساتواں مہینہ'' جبکہ قدیم اُصول کے مطابق مارچ کو سال کا پہلا مہینہ شمار کیا جاتا تھا۔
اکتوبر	اس کے معنی ہیں ''آٹھواں مہینہ'' جبکہ قدیم اُصول کے مطابق مارچ کو سال کا پہلا مہینہ شمار کیا جاتا ہے۔
نومبر	اس کے معنی ہیں ''نواں مہینہ'' جبکہ قدیم اُصول کے مطابق مارچ کو سال کا پہلا مہینہ شمار کیا جاتا تھا۔
دسمبر	اس کے معنی ہیں ''دسواں مہینہ'' جبکہ قدیم اُصول کے مطابق مارچ کو سال کا پہلا مہینہ شمار کیا جاتا تھا۔

(ملاحظہ ہو: الجواہر فی تفسیر القرآن الکریم، ج:۵،ص:۱۱۰، طبع دوم:۱۳۵۳ھ)

موجودہ سنِ عیسوی کی اصلاح سب سے پہلے جولیس قیصر کے زمانہ میں ہوئی تھی۔ قیصر مذکور نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے ۴۵ سال قبل ۷۰۹ رومی میں اسکندریہ سے مصر کے مشہور فلکی سوسی جینس (SOSI GENES) کو اس غرض سے طلب کیا تھا کہ سالِ شمسی کو مرتب و منظّم کردے، چنانچہ اس نے اولاً اعتدالِ ربیعی کا دن رصد سے معلوم کیا تو اس کے حساب سے ۲۵/ مارچ کا دن نکلا، پھر فلکی مذکور نے حسبِ ذیل نقشہ کے مطابق قیصر کے لیے سنِ شمسی کو مرتب کردیا:

تعدادایام	رومی مہینوں کے نام	مہینوں کے موجودہ نام
۳۱	جانواریوس	جنوری
۲۹/اور سال کبیسہ میں ۳۰	فبرواریوس	فروری
۳۱	مارتیوس	مارچ
۳۰	اپریلیس	اپریل
۳۱	مایوس	مئی
۳۰	یونیوس	جون

جولائی	کینٹلیس	۳۱
اگست	سیکٹیلس	۳۰
ستمبر	ستنبر	۳۰
اکتوبر	اکتوبر	۳۱
نومبر	نومبر	۳۰
دسمبر	دسمبر	۳۱

فلکی مذکور نے ماہِ فروری کے بارے میں یہ قاعدہ مقرر کیا تھا کہ وہ ۳/سال تک مسلسل ۲۹/ دن کا ہوا کرے گا، ہر چوتھے سال ۳۰/دن کا شمار کیا جائے گا، جولیس قیصر نے اس اصلاح کی یادگار میں ماہِ کینٹلیس (مطابق ماہِ تموز) کا نام بدل کر اپنے نام کی نسبت سے اس کا نام ''جولائی'' کردیا۔

سنِ عیسوی میں دوسری تبدیلی

بعد کو جب شاہ اگستس (Augustus)[1] نے اس کی گدی سنبھالی تو چونکہ یہ بڑا مغرور خود پرست بادشاہ تھا اور جیسا کہ بیرونی کا بیان ہے: سب سے پہلے ''قیصر'' کا لقب بھی اسی نے اختیار کیا ہے اور اس کی وجہ تسمیہ بیرونی نے یہ لکھی ہے کہ: ''قیصر'' کے معنی فرنگی زبان میں اس چیز کے آتے ہیں جس کو چاک کر کے نکالا گیا ہو، چونکہ اس کی ماں دردِ زہ میں مرگئی تھی اور اس کو شکم مادر سے چاک کر کے نکالا گیا تھا، اس لیے اس کا لقب ہی ''قیصر'' پڑ گیا۔ اگستس از راہِ تکبر اکثر کہا کرتا تھا کہ میں اندامِ نہانی کے راستہ باہر نہیں آیا۔[2]

بہرحال جب یہ تخت نشین ہوا تو اس کی آتشِ حسد نے جوش مارا اور اسے خیال ہوا کہ جولیس کے نام کو تو اس اصلاح کی بدولت بقائے دوام حاصل ہوا کہ ماہ ''جولائی'' ہر سال اس کی یاد تازہ کرتا رہتا ہے، آخر میں اس سلسلہ میں اپنی یادگار کیوں نہ چھوڑوں، اس خیال سے اس نے بھی ماہ ''سکستیلس'' جو جولائی کے بعد آتا ہے اپنے نام پر ''اگست'' سے موسوم کردیا اور چونکہ یہ مہینہ ماہ ''آب'' کے مطابق تھا جس کے تیس دن ہوتے ہیں، اس لیے اس کے تکبر نے اس بات کو بھی گوارا نہ کیا کہ جو مہینہ اس کے پیش رَو کے نام سے منسوب ہے وہ تو اکتیس دن کا ہو اور جو مہینہ خود اس کے نام پر موسوم ہو وہ تیس دن کا، اس لیے اس نے اس سن میں بمقتضائے ''ایجادِ بندہ اگرچہ گندہ'' یہ

حاشیہ:۱.....''اگست'' کے معنی حسن وفقی بک نے مقدس کے لکھے ہیں۔

حاشیہ:۲.....ملاحظہ ہو، الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ، ص:۲۹۔

اصلاح کی کہ ماہ ''اگست'' کو بھی بجائے تیس کے اکتیس ہی کا قرار دے دیا اور ماہِ فروری کے بارے میں جو تین سال تک انتیس کا اور ہر چوتھے سال تیس دن کا شمار کیا جاتا تھا، یہ قاعدہ وضع کیا کہ آئندہ سے یہ ایک دن کم کر کے تین سال تک اٹھائیس دن کا اور ہر چوتھے سال انتیس دن کا شمار ہوا کرے گا۔ جولائی اور اگست کے پیہم ۳۱، ۳۱ دن کے ہونے کی اصل حکمت یہ ہے، یہ ''تقویم جولیس'' سے موسوم ہے۔

سنِ عیسوی میں تیسری اصلاح

پھر ۱۰۷۹ رومی یعنی ۳۷۰ جولیسی مطابق ۳۲۵ عیسوی میلادی میں شہر ازنیق میں جو اَناطولیہ کے مضافات میں واقع ہے، پوپ پادریوں کی ایک روحانی مجلس اس غرض سے منعقد ہوئی کہ عیسائیوں کی عیدوں اور ان کے مقدس دنوں کی تعیین کی جائے، چنانچہ اس مجلس نے تاریخ عیسوی کا مبدأ حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام کی ولادت باسعادت کو قرار دیا۔ ارکانِ مجلس کی رائے میں حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام کی ولادت ۲۶ / دسمبر کو ہوئی تھی، اس لیے یکم جنوری سے سنِ عیسوی میلادی کا آغاز قرار دیا گیا۔ اس مجلس نے ''تقویم جولیس'' کو جوں کا توں برقرار رکھا، بجز اس کے کہ ''اعتدال ربیعی'' کا دن بجائے ۲۵ / مارچ کے اب سے ۲۱ / مارچ مقرر کر دیا گیا، کیونکہ سوسی جینس فلکی نے جب جولیس قیصر کے زمانے میں رصد سے ''اعتدالِ ربیعی'' کا وقت معلوم کیا تھا تو وہ ۲۵ / مارچ کا دن تھا، لیکن اب ۳۷۰ برس گزر جانے کے بعد جب ازنیقی مجلس نے رصد سے اس کا حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ اب تک چار دن کا فرق پڑ چکا ہے اور اب ''اعتدالِ ربیعی'' کا دن بجائے ۲۵ / مارچ کے ۲۱ / مارچ ہو گیا ہے، کیونکہ آفتاب اول برجِ حمل میں اسی تاریخ کو داخل ہوتا ہے۔

بہرحال ان پادریوں نے یہ اصلاح کر کے اپنی عیدوں، تہواروں اور مقدس دنوں کا تعین اسی اصلاح یافتہ سن کے اعتبار سے کر لیا، لیکن سارے ارکانِ مجلس میں سے کسی کو اتنا خیال نہ آیا کہ ''اعتدالِ ربیعی'' میں یہ چار دن کا فرق ۳۷۰ سال کے عرصہ میں کیسے پڑ گیا؟! اور آئندہ اس کی کیا صورت ہو کہ پھر یہ فرق نہ پڑنے پائے، مگر انہوں نے اتنی ہی اصلاح ضروری سمجھی اور مدت تک مذہبی دنوں کے تعین کے سلسلہ میں اسی طریقہ کار پر عمل درآمد ہوتا رہا۔

سنِ عیسوی کا استعمال کب سے شروع ہوا؟!

پھر ۵۲۸ء سے تاریخ میلادی کا استعمال شروع ہوا اور رفتہ رفتہ تمام مسیحی اقوام میں سن عیسوی کا عام رواج ہو گیا، جو بغیر کسی ادنیٰ تغیر وتبدل کے ''تقویم جولیس'' کے مطابق سولہویں صدی

کے اخیر تک رائج رہا۔ (۱)

سنِ عیسوی میں چوتھی اصلاح

پھر سولہویں صدی عیسوی کے آخر میں پوپ گریگوری سیز دہم نے اس حساب میں یہ اصلاح کی کہ ''تقدیم جولیس'' میں سے دس اور گھٹا دیئے، چنانچہ اس نے یوم پنجشنبہ ۴/اکتوبر ۱۵۸۲ء کے بعد والے جمعہ کی تاریخ ۵/اکتوبر کے بجائے ۱۵/اکتوبر قرار دی اور یہ قاعدہ بنایا کہ ۱۷۰۰ء، ۱۸۰۰ء اور ۱۹۰۰ء میں کبیسہ کا دن ضم نہ کیا جائے اور آئندہ سے ہر تین سال ۳۶۵ دن معمول کے مطابق شمار کیے جائیں اور ہر چوتھا سال ۳۶۶ دن کا سال کبیسہ مانا جائے۔

اس اصلاح کا سبب یہ تھا کہ شمس کی حرکتِ دَوری حقیقت میں وہ نہ تھی جو جولیس کی تقویم میں مقرر کی گئی تھی، یعنی دَورِ شمسی کی مدت (۲۵۰۵[۳۶۵] دن) نہ تھی، بلکہ (۲۴۲۲۱۶، [۳۶۵] دن) تھی اور اسی غلطی کا یہ نتیجہ تھا کہ جس طرح سابق ''تقویم'' جولیس کے حساب سے ''اعتدالِ ربیعی'' کا دن ۲۵/مارچ کی بجائے ۲۱/مارچ ہو گیا تھا، اب بجائے ۲۱/مارچ کے ۱۱/مارچ ہو گیا تھا، چنانچہ جب یہ نکتہ پوپ صاحب پر کھلا تو مجبوراً ان کو اس حساب میں سے دس دن کم کر کے اپنے ایام مذہبی کی تعیین کرنی پڑی، جب سے آج تک پوپ صاحب کی اسی اصلاح کے مطابق عمل درآمد چلا آرہا ہے، آگے اللہ جانے اور کیا اصلاح کرنی پڑے!۔

تقویم گریگوری اور مسیحی اقوام

پوپ گریگوری کی مذکورہ تصحیحات کو سب سے پہلے فرانس میں سندِ قبول عطا کی گئی، چنانچہ وہاں کے شاہ ہنری سوم کے حکم سے یک شنبہ ۹/دسمبر کے بعد جو دوشنبہ آیا تو اس روز بجائے دسمبر کی ۱۰/تاریخ کے ۲۰/تاریخ قرار دی گئی اور اس وقت سے لے کر ۲۲/ستمبر ۱۷۹۲ء تک فرانس میں اسی تاریخ پر عمل ہوتا رہا۔ پھر ۲۲/ستمبر ۱۷۹۲ء سے حکومت فرانس نے اپنے سن میں یہ تبدیلی کر دی کہ آغازِ سال، شمس کے

حاشیہ:۱.....فارسی زبان کے کسی شاعر نے انگریزی مہینوں اور سال کبیسہ (لوند کے سال) کے معلوم کرنے کے قاعدہ کو اس طرح نظم کر دیا ہے:

جنوری و فروری و مارچ اپریل و مئی — جون جولائی اگست و نیز سیتمبر بدان
هست اکتوبر نومبر هم دسمبر آخریں — از شهور سال انگریزی بسان رومیان
پس بود اپریل وجون ونیز سیتمبر دگر — شد نومبر ایں همه سی روزه باشد درمیان
فروری دو کم بود لیکن بسال چارمین — یک بریں افزا کبیسه بست ونه گرد و عیان
هفت باقی سی و یک روز است گر قسمت کنی — سالهائے عیسوی بر چار تا اے مهربان
بر نیاید کسر گر سال کبیسه شد همین — در بر آید بس بترک کسر کن تقسیم آن
گر یکے ماند ز سال بے کبیسه اول است — در دو دوم در سه سوم سال باشد بیگمان

نقطۂ ’’اعتدالِ خریفی‘‘ پر آ جانے سے قرار دیا اور سال کے سب مہینے تیس تیس دن کے کر دیئے، پھر اختتامِ سال پر معمولی سالوں میں ۵؍دن اور سال کبیسہ میں ۶؍دن کا اضافہ مقرر کیا، تاکہ شمسی کی تکمیل ہو سکے۔ ۱۸۰۵ء کے اختتام تک حکومتِ فرانس اسی حساب پر عامل رہی، پھر ۱۷؍جنوری ۱۸۰۶ء سے گریگوری کی تقویم پر حسبِ سابق عمل شروع ہوگیا۔

لیکن حکومتِ انگلستان ۱۷۵۱ء تک ’’تقویم جولیس‘‘ ہی پر عمل کرتی رہی، بعد کو جارج دوم کے زمانے میں اس کے عہدِ حکومت کے چوبیسویں سال حسبِ قرار دادِ پارلیمنٹ اس تقویم کو ترک کر کے گریگوری کی تقویم کو قبول کیا گیا، چنانچہ ۲؍ستمبر ۱۷۵۲ء یوم چہارشنبہ کے بعد یوم پنجشنبہ کو بجائے ۳؍ستمبر کے ۱۴؍ستمبر تاریخ قرار دی گئی۔ اس سے پہلے چارسو سال انگریزوں کا مالی سال ۲۵؍مارچ سے شروع ہوتا تھا، اب ۱۷۵۳ء سے سال کا پہلا دن یکم جنوری کو قرار دیا گیا۔ (۱)

روس میں سال کا آغاز ستمبر کی پہلی تاریخ سے ہوتا تھا، ۱۶۹۹ء میں قیصرِ روس پطرس کبیر نے یہ حکم دیا کہ روس میں بھی یورپ کی طرح سال کا آغاز یکم جنوری سے قرار دیا جائے۔ قیصرِ روس پطرس مذکور نے آغازِ سال کا دن تو بدلوا دیا، لیکن اس سے اتنا نہ ہوسکا کہ ’’تقویم جولیس‘‘ کو ہٹا کر گریگوری کی تقویم کو نافذ کر دیتا، نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم تک روس اور یونان میں عملدرآمد اسی غلط تقویم پر ہوتا رہا، تا آنکہ روس میں انقلاب آیا، زار کی حکومت کا تختہ اُلٹا اور کمیونزم کا راج ہوگیا۔ بعدازاں یکم اکتوبر ۱۹۲۳ء کو روس اور یوگوسلاویہ کے چرچ نے سن عیسوی کے شمار کے لیے جولیس کے حساب کو بدل کر گریگوری کے حساب کو اختیار کر لیا۔

غرض گریگوری سیزدہم نے اوائل مارچ ۱۵۸۱ء میں سن عیسوی کی اصلاح کا حکم دیا، چنانچہ مجلس ازنیقی کے وقتِ انعقاد سے لے کر اب تک یعنی ۳۲۵ء سے لے کر ۱۵۸۲ء تک تقریباً دس دن کا فرق جو ۱۲۵۷ سال میں ہوگیا تھا، اس کو درست کرنے کی غرض سے جمعہ ۱۵۸۲ء کو اکتوبر کی ۵؍تاریخ کے بجائے ۱۵؍تاریخ شمار کی گئی اور اس روز سے کیتھولک فرقہ نے جس کی حکومتیں فرانس، اٹلی، اسپین اور پرتگال میں قائم تھیں اسی تاریخ پر عمل شروع کر دیا، لیکن پروٹسٹنٹ نے اس اصلاح کو ۱۷۰۰ء سے پہلے قبول نہیں کیا اور انگریزوں نے تو اس کو ۱۷۵۲ء میں اپنے یہاں نافذ کیا ہے، سب سے آخر میں اس اصلاح کو آرتھوڈکس فرقہ نے قبول کیا، جس کے پیرؤ روس اور یوگوسلاویہ اور دیگر ریاستہائے بلقان میں ہیں اور اب تو سارے یورپ میں یہی تاریخ مروج ہے۔ (۲)

حاشیہ:۱..... اس ساری تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، تقویم القدیم از حسن وفقی بک، ص: ۱۱۰ تا ۱۱۹، مطبع سلفیہ قاہرہ ۱۳۴۵ھ۔

حاشیہ:۲..... یہ واضح رہے کہ انگریزوں کو تو اپنے سنِ مروجہ کی غلطی ۱۷۵۲ء میں معلوم ہوئی، مگر ہندوستان کے مسلمانوں نے اس غلطی کی نشان دہی ان کی اصلاح سے ۳۳ سال پہلے ۱۷۱۹ء میں کر دی تھی۔ ملاحظہ ہو: زیچ بہادرخانی، بابِ ہفتم در معرفت تاریخ عیسوی از مولوی غلام حسین جون پوری، طبع بنارس ۱۸۵۳ء۔

یہ ہے اس سن عیسوی کا تاریخی جائزہ جس پر ساری مسیحی دنیا کا دارومدار ہے۔ مقامِ عبرت ہے کہ اتنی بڑی قوم برسوں نہیں صدیوں تک اپنے مقدس دنوں، عیدوں، تہواروں اور روزوں کے ایام کو گم کیے رہی اور خود اپنے اقرار کے مطابق ۱۵۸۲ء تک صحیح دنوں کی تعیین نہ کرسکی، بلکہ عباداتِ مذہبی کو اسی غلط حساب کے مطابق ادا کرتی چلی آئی، یہیں سے اس امر کا بھی اندازہ لگالیجئے کہ جس قوم نے اپنے مقدس دنوں کو گم کردیا، وہ اپنے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی مقدس تعلیم کو کس طرح محفوظ رکھتی ؟!۔ تمام عیسائی دنیا کا اپنے اصلی دنوں کو گم کردینا اسی ضلال و اضلال کا ایک نمونہ ہے، جس کے متعلق قرآن عظیم میں ارشاد ہے: ''**یا أھل الکتاب لاتغلوا فی دینکم غیر الحق** ''.....یعنی .....''اے اہل کتاب! اپنے دین کی بات میں ناحق کا مبالغہ مت کرو۔''

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

مکاتیب علامہ محمد زاہد کوثری رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ وترتیب: مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

...بنام...مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ

(گیارہویں قسط)

﴿ مکتوب:......۱۸ ﴾

اخی فی اللہ، مولانا، ماہرِفن علامہ، استاذِ کبیر سید محمد یوسف بنوری حفظہٗ اللّٰہ ورعاہ

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد سلام! آپ کا مکتوبِ گرامی موصول ہوا، جس پر ۲۴ رمضان سنہ ۱۳۶۶ھ تاریخ درج تھی، آپ کی صحت وعافیت پر میں نے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا شکر ادا کیا، اور اللہ سے دعا گو ہوں کہ سفر کے حوالے سے وہی صورت آپ کے لیے آسان فرمائے جس میں خیر ہو۔

عزیز تر بھائی! آپ نے (میرے تعلق سے) اپنے ان روشن موتیوں کی مانند اشعار سے مجھے شرمسار کردیا ہے، یہ اشعار ایک ایسے شخص کے بارے کہے گئے ہیں جو ان میں درج ثناء وتعریف کے دسویں حصے کا بھی اہل نہیں، (۱) شاید آپ کی اکسیر، بنوری وآدمی (۲) نگاہ مجھ خزف ریزے کو جوہر بناڈالے، اللہ تعالیٰ سے پر امید ہوں کہ وہ آپ کو ہمیشہ خیر وعافیت کے ساتھ دین وعلومِ دین کی خدمت کی توفیق مرحمت فرمائے گا۔

’’شرح معانی الآثار‘‘ (کی طباعت کے معاملے) سے میرا کوئی تعلق نہیں، باری آنے پر مولانا ابوالوفاء اور ان کے عزیز احباب کے منصوبے میں اس کی طباعت بھی داخل ہے۔

میں اپنے بھائیوں کو قلبی تشویش میں مبتلا کرنا پسند نہیں کرتا، اس لیے بتکلف اپنی صحت کے متعلق گفتگو نہیں کرتا، ہم اللہ کی کتنی نعمتوں میں لوٹ پوٹ ہورہے ہیں، اب اگر عارضی طور پر کوئی ناخوش کن بات پیش آبھی جائے تو ہمیں اس کے شکوے کا حق نہیں، کشادگی وتنگی دونوں حالتوں میں وہ شکر یہ کا مستحق ہے، میں ’’شرح معانی الآثار‘‘ جیسے بڑے کاموں کی طاقت نہیں رکھتا، حتیٰ کہ اپنی

موت سے قبل تکمیل کی حرص میں ’’النکت‘‘ کی تدوین میں بھی جلد بازی سے کام لیا ہے، ادھر سال بھر سے اہلیہ بیمار ہیں، اور اللہ سبحانہٗ کی جانب سے ہی شفا ملے گی، البتہ آپ سے بابرکت دعاؤں کی امید ہے۔

گزشتہ خط میں بھی ذکر کیا تھا کہ آپ کے قیمتی ہدایا سے مجھے خوشی ہوتی ہے، معلوم نہیں کہ مولانا ظفر احمد تھانوی کی ’’إعلاء السنن‘‘ کے گیارہویں حصے کے حصول میں کامیابی ممکن ہے یا نہیں؟

جس موضوع کی جانب آپ نے اشارہ کیا تھا، اس کے متعلق تاحال کوئی کتاب نہیں ملی، مراد پاتے ہی ان شاء اللہ! جلد ارسال کردوں گا، البتہ ’’النکت‘‘ کے پانچ نسخے کافی عرصہ قبل (ساز وسامان) برآمد کرنے والے کو بھیج چکا تھا کہ آپ کو ارسال کردے، چند روز قبل اچانک اس شخص سے ملاقات ہوئی تو مجھے بتایا کہ اب تک برآمد کی اجازت نہیں مل سکی، اس کا کہنا تھا کہ اللہ کے حکم سے جلد ہی اس گھاٹی کو عبور کر کے بھیج دوں گا، یہ عارضی مشکلات دور ہو جائیں گی، ان شاء اللہ تعالیٰ!

میں آپ سے اپنے (حضرت بنوریؒ کے) جدِّ امجد (۳) کے اس قول کو پیشِ نگاہ رکھنے کی امید رکھتا ہوں: ’’فتنے (کے زمانے) میں اس یک سالہ اونٹ کی مانند ہوجاؤ جو نہ دودھ دے سکے اور نہ سواری کے قابل ہو۔‘‘ پرخطر وشرانگیز اجتماعی مسائل کے متعلق درشت گفتاری سے بقدرِ استطاعت دور رہتے ہوئے حکمت کے ساتھ اتحاد واتفاق کے لیے کوشاں رہیں، ہم قابلِ بحث امور کو نرم گفتاری کے ساتھ حل کریں اور درشتی کے جواب میں سخت اسلوب اپنائیں، خصوصاً ان احوال میں (یہی رویہ قابلِ عمل ہے)۔ مکرر اُمید رکھتا ہوں کہ علومِ تصوف کے تقاضوں کے ساتھ تصادم سے بچاؤ کے لیے ہم ذوقی علوم کے مباحث کا دروازہ ہی نہ کھولیں۔ یہ لامذہب لوگ مسلمانوں کے افتراق کی کوشش میں مشغول ہیں، یہ طرزِ عمل فروعی مسائل میں تو کسی قدر برداشت کیا جاسکتا ہے، لیکن اعتقادی مسائل میں اس کی گنجائش نہیں، وہ کھلی تجسیم میں مبتلا ہیں، ان کے افکار واقوال کے واضح لازمی نتائج کو ان کی طرف منسوب کریں، تاکہ اُنہیں رشد وہدایت کی جانب لوٹایا جاسکے۔ ’’خرافۃُ الأوعال‘‘ (۴) کے حوالے سے صاحب ’’العون‘‘ (۵) اور صاحب ’’التحفۃ‘‘ کا کلام ان کے عیب دار طرزِ فکر کو بے نقاب کرتا ہے، حالانکہ اس (حدیث) کی سند میں ’’عللِ قادحہ‘‘ ہیں، اللہ تعالیٰ ہی اپنے حبیب کے وسیلے سے ہمارے احوال کی اصلاح فرمائے۔ (آمین)

آخر میں مواقعِ قبولیت آپ کی نیک دعاؤں کا امیدوار ہوں میرے عزیز تر بھائی!

مخلص

محمد زاہد کوثری

شوال سنہ ۱۳۶۶ھ

شارع عباسیہ نمبر ۶۳

عزیز احباب کو ان کی مبارک دعاؤں کی تمنا کے ساتھ میرا سلام پہنچایئے۔

حواشی وحوالہ جات

۱:......حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ کوثریؒ کی شخصیت وعلم اوران کی تالیفات کی مدح میں دوقصیدے لکھے تھے، جن میں سے ایک ان کے دیوان ’’القصائد البنورية‘‘ میں شائع ہو چکا ہے، یہاں اسی قصیدے کی جانب اشارہ ہے، مزید دیکھیے: آگے مکتوب نمبر۳۲۔

۲:......حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ اور ہمارے جدامجد، عارف باللہ شیخ آدم بن اسماعیل بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی جانب اشارہ ہے، جو سلسلہ نقشبندیہ کے بڑے مشائخ میں شمار ہوتے تھے، حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے خلفاء میں سے تھے، سنہ۱۰۵۳ھ میں مدینہ منورہ میں وفات ہوئی اور ’’جنۃ البقیع‘‘ میں مدفون ہوئے، ان کے احوالِ زندگی کے متعلق مستقل کتاب ہے۔ ملاحظہ کیجیے: ’’نزهة الخواطر‘‘ مولانا عبدالحی حسنی (ج:۵،ص:۴۵۱)، ’’نفحة العنبر‘‘ حضرت بنوریؒ۔ (حاشیہ، ص:۲۶۷-۲۶۸) اور تاریخ دعوت وعزیمت (جلد چہارم) مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ۔

۳:......حضرت علی بن ابوطالب کرم اللہ وجہہٗ مراد ہیں، ان کا یہ جملہ رضی کی ترتیب دادہ ’’نهج البلاغة‘‘ میں درج ہے، دیکھیے: ’’نهج البلاغة مع شرح ابن أبي الحديد‘‘: (ج:۴،ص:۲۳۱) اور ’’الإمتاع والمؤانسة‘‘ ابوحیان توحیدی (ج:۲،ص:۳۱)۔

۴:......’’حديث الأوعال‘‘ کے متعلق مزید کلام مکتوب نمبر:۱۱۲ اور اس کے حواشی میں گزر چکا ہے۔

۵:......’’عون المعبود شرح سنن أبي داود‘‘ مولانا شمس الحق عظیم آبادی (ج:۴،۱۳ تا ۱۸) رقم الحدیث:۴۷۰۷۔

﴿ مکتوب:......۱۹ ﴾

جناب استاذِ جلیل وعلامہ اصیل سید محمد یوسف بنوری **حفظه الله ورعاه وأطال بقاءهٗ في خير وعافية، منتجا لآثار قيمة تنفع المسلمين** (اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت فرمائے، خیروعافیت کے ساتھ طویل عمر عنایت فرمائے، تاکہ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کو مفید قیمتی آثار مہیا ہوں)

بعد سلام! آپ کا مکتوبِ گرامی ۲۰ر ذوالحجہ کو نہایت مسرت کے ساتھ وصول کیا، میں نے کشمیر ہوٹل کراچی کے پتے پر آپ کو ایک خط ارسال کیا تھا، نجانے آپ کو پہنچا یا نہیں؟! اس میں من جملہ دیگر امور کے ’’العبقات‘‘ نہ بھیجنے کی اُمید ذکر کی تھی، اس لیے کہ اس عظیم ایثار پر شکریہ کے باوجود آپ کا نسخہ ہتھیانا نہیں چاہتا، محض اتنی خواہش ہے کہ کسی روز کتابوں کے کسی تاجر کے ہاں اس کتاب کا نسخہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں تو مجھے بھیج دیں، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا شکر ہے کہ پشاور میں (لگنے والی) آگ زیادہ پھیلی نہیں، اور آپ کے اہلِ خانہ اس آزمائش سے محفوظ رہے۔ اللہ تعالیٰ دائمی عزت وکرامت کے ساتھ دیگر (مسلمان) بھائیوں کی تکالیف کا بھی جلد ازالہ فرمادے، یہ معاملہ وسعتِ ظرفی اور حسنِ تدبیر کے ساتھ ساتھ اللہ سبحانہٗ کی توفیق کا زیادہ محتاج ہے۔

’’مجلسِ علمی‘‘ کے کراچی منتقل ہونے کی مسرت انگیز خبر نے مجھے سرشار کردیا۔ اللہ سبحانہ دینی ودنیوی اموراور علم ودین کی خدمت کے حوالے سے مولانا موسیٰ میاں مرحوم کے ان محترم فرزندوں کی دست گیری فرمائے، اللہ کے لیے یہ مشکل نہیں۔

کافی عرصہ قبل میں نے کراچی میں مولانا (شبیر احمد) عثمانی کو بعض طبع شدہ رسائل ارسال کیے تھے، شاید آپ کی وہاں موجودگی کے دوران ان تک نہیں پہنچے، مولانا ظفر احمد تھانوی کو بھی ممبئی [1] کے ایک ترکی تاجر - جو علمی شغف رکھتے ہیں اور مولانا سے واقف ہیں - کے ہاتھ ''النکت'' کا ایک نسخہ بھیجا تھا، اگر وہ ان تک نہ پہنچا ہو تو از راہِ کرم آپ اس کتاب کے چند نسخے تصحیح کے بعد انہیں بھیج دیں، اگر آپ وہ نسخے احباب میں تقسیم نہ کر چکے ہوں۔

میری اہلیہ اب گھر کے اندر چل پھر لیتی ہیں، اپنے امور کے متعلق آپ کی توجہ واہتمام پر شکر گزار ہوں، امید ہے کہ میری جانب سے اپنے جلیل القدر والد کی دست بوسی فرمائیں گے، ان کی بابرکت دعاؤں کا متمنی ہوں، آپ سب ہمیشہ سعادت مند و باتوفیق رہیں، میرے عزیز تر بھائی!

مخلص

محمد زاہد کوثری

ذوالحجہ سنہ ۱۳۶۶ھ

مواقعِ قبولیت میں دعاؤں کے لیے پُر اُمید ہوں۔

حواشی وحوالہ جات

۱:......ڈاکٹر سعود سرحان کے مطابق اصل خط میں یہاں ایک لفظ اُن کے پڑھنے میں نہیں آیا۔

(جاری ہے)

''بینات'' (اردو/عربی) کے اجراء کا طریقہ

1:...جو حضرات دفتر ''بینات'' تشریف لا سکتے ہوں، وہ دفتر آ کر اپنا مکمل پتہ اور فون نمبر درج کرانے کے ساتھ ماہنامہ ''بینات'' اردو کے لیے مبلغ 400 روپے اور سہ ماہی ''البینات'' عربی کے لیے 100 روپے سالانہ فیس جمع کرائیں۔

2:...دور رہنے والے حضرات اپنے مکمل پتہ کے ساتھ مذکورہ فیس کا منی آرڈر دفتر ''بینات'' کے پتہ پر بھیجیں اور منی آرڈر کے آخر میں یہ وضاحت ضرور فرمائیں کہ یہ رقم رسالہ ''بینات'' (اردو یا عربی) کے اجراء کے لیے ہے۔

3:... یا ''بینات'' کے بینک اکاؤنٹ میں مذکورہ فیس جمع کروا کر بینک سے ملنے والی رسید اسکین کر کے اپنے نام، مکمل پتہ اور فون نمبر کے ساتھ ''بینات'' کے ای میل ایڈریس پر میل کر دیں۔ یا بذریعہ ڈاک بھیج دیں۔

نوٹ:... پرانے خریدار بھی مذکورہ طریقوں سے سالانہ فیس جمع کرا سکتے ہیں، مگر ان کے لیے اپنے خریداری نمبر کی وضاحت ضروری ہے (اردو اور عربی کی تعیین کے ساتھ)۔

سفرِ ترکی کے چند مشاہداتی تأثرات!!

حضرت مولانا فضل محمد یوسف زئی

استاذِ حدیث جامعہ بنوری ٹاؤن

۲۲/نومبر ۲۰۱۷ء بروز بدھ صبح نو بجے قطر ایئرلائن کے ذریعہ ''ہیومن فاؤنڈیشن'' کے چیئرمین جناب حاجی محمد احمد صاحب کی سرپرستی میں ہم کراچی کے جناح انٹرنیشنل ائیرپورٹ سے ترکی کے سفر پر روانہ ہوئے۔ ہم کل دس ساتھی تھے، پانچ کراچی سے اور پانچ ساتھی اسلام آباد سے آئے تھے۔ قطر ایئرپورٹ دوحہ میں ہم سب ساتھی اکٹھے ہوگئے اور وہاں سے ترکی کے دار الخلافہ انقرہ کے لیے نیا خوشگوار سفر شروع ہوا، ساڑھے چار گھنٹے فضائی سفر کے بعد ہم انقرہ ائیرپورٹ پر اُترے، وہاں کے ساتھیوں نے ہمیں وصول کیا اور انقرہ ہی میں رات گزاری۔ انقرہ اگرچہ ترکی کا دار الخلافہ ہے، لیکن یہ زیادہ بڑا شہر نہیں ہے۔

جناب حاجی محمد احمد صاحب ایک خداترس انسان ہیں، دنیا کے جس خطہ میں بھی مسلمانوں پر جب کوئی آفت اور مصیبت پڑتی ہے تو ممکنہ حد تک حاجی صاحب ہر قسم کے تعاون اور مدد کے لیے میدان میں آجاتے ہیں۔ سرزمینِ شام کے عرب سنی مسلمانوں پر وہاں کے ظالم حکمران بادشاہ بشار الاسد کے مظالم سے دوچار ہونے والے لاکھوں کی تعداد میں وہاں کے سنی مسلمان ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے، ترکی کے ساتھ شام کی سرحد لگتی ہے، اس لیے وہاں کے مہاجرین کی ایک بڑی تعداد تقریباً پانچ لاکھ مہاجرین صرف ایک شہر استنبول میں آکر پناہ گزین ہیں اور ترکی کے دیگر شہر بھی بے شمار پناہ گزینوں کی پناہ گاہ ہیں۔ ترکی کے بالکل قریب شام کی اپنی سرحد جو بشار الاسد کے ظلم کے پنجوں سے نسبتاً محفوظ ہے، اس میں ہزاروں خیموں کا شہر آباد ہے جس میں لاکھوں بے بس مسلمان بے سروسامانی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں، میں نے دیکھا تو تاحدِ نگاہ خیمے ہی خیمے نظر آرہے تھے، ساتھیوں نے بتایا کہ ان خیمہ بستیوں میں (۷۰) ستر لاکھ پناہ گزین موجود ہیں۔ ''ہیومن فاؤنڈیشن'' کے چیئرمین جناب محمد احمد صاحب زیادہ تر کنٹینروں کے ذریعہ سے ان مہاجرین تک غذائی اجناس پہنچانے کی کوشش کررہے ہیں،

اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے، بڑے باہمت آدمی ہیں، انہوں نے جانے والے ساتھیوں سے کہا تھا کہ ترکی کا ٹکٹ آپ لوگ خود کریں، باقی وہاں رہنے سہنے اور کھانے پینے کا انتظام میں کروں گا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے، ان کی وجہ سے ہمیں ترکی کے مقدس مقامات دیکھنے کا موقع بھی ملا اور شام کے مجبور مہاجرین سے ملاقات اور ہمدردی کا جذبہ بھی ملا۔ بہر حال ہم انقرہ سے بذریعہ جہاز ترکی کے دوسرے بڑے شہر ''عُرفہ'' کے لیے روانہ ہوگئے، یہاں ہم نے ایک دن اور ایک رات گزاری اور چند خاص مقامات کی زیارت کی، جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

ا:.....سیدنا حضرت ایوب علیہ السلام کا وہ چشمہ ''عرفہ'' کے علاقے میں ہے جس چشمہ سے حضرت ایوب علیہ السلام نے غسل کیا اور بیماری سے شفایاب ہوگئے، یہاں آپ کے نام پر مسجد ہے اور ایک جگہ پانی ہے وہاں کے لوگوں نے کہا کہ یہ پانی اسی چشمہ سے آتا ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اس طرح کیا ہے:

''اُرْکُضْ بِرِجْلِکَ هٰذَا مُغْتَسَلٌ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ۔'' (ص:۴۲)

ترجمہ: ''اپنے پاؤں سے زمین کو مارو یہ ٹھنڈا پانی ہے جس سے غسل کرو اور پانی پی لو۔''

۲:.....عُرفہ کے علاقہ میں دوسرا بڑا تاریخی مقام آتشِ نمرود ہے، جس میں نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو منجنیق کے ذریعہ سے بڑی آگ میں پھینکا تھا اور آگ کو اللہ تعالیٰ نے گل وگلزار بنادیا تھا، یہ ایک پہاڑی ہے جس پر دو بڑے ستون آمنے سامنے کھڑے ہیں، کہتے ہیں کہ انہیں ستونوں کے ساتھ وہ جھولا باندھا گیا تھا جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بٹھا کر پھینکا گیا تھا، نیچے ایک وادی نما علاقہ ہے، اب وہاں پر ایک بڑی نہر بہہ رہی ہے جس میں لاکھوں مچھلیاں پانی کے اوپر اچھلتی کودتی نظر آرہی ہیں، اس پہاڑی پر ایک پرانا ویران قلعہ نظر آتا ہے، لوگ کہتے ہیں کہ یہ نمرود کا قلعہ تھا، عرفہ سے ''کلس'' جاتے ہوئے رات کے وقت دیر تک ہم دریائے فرات کے کنارے محوِ سفر رہے، کاش! ہم نے دریائے فرات کو دن کے وقت دیکھا ہوتا، یہی دریائے فرات بغداد کے پاس سے بھی گزرتا ہے۔

ترکی، عراق اور شام آپس میں پڑوسی ممالک ہیں، ایسا لگتا ہے کہ خلافت عثمانیہ کے وقت عراق اور شام کے کئی علاقے ترکی کے اندر آگئے ہیں، اسی لیے یہ تاریخی مقامات اب ترکی میں شامل ہوگئے ہیں، انہی علاقوں میں آج کل ''انطاکیہ'' آگیا ہے، انطاکیہ میں حبیب النجار شہید کی قبر بھی ہے، (جن کا سورۂ یٰسین میں ذکر ہے) یہ زمین سے کافی نیچے ایک غار میں ہے، ان کے ساتھی بھی وہیں پر ہیں، حبیب نجار کی قبر ایک دیوار کے ساتھ پیوست ہے، قبر بالکل نمایاں نظر آتی ہے، قرآن عظیم کی سورت یٰسین میں اللہ تعالیٰ نے ان کا اور ان کے تین ساتھیوں کا قصہ بیان فرمایا ہے اور ان کی شہادت کا

واقعہ بھی بیان کیا ہے، ان قبروں سے ہمیں قرآن عظیم کی صداقت کا عین الیقین حاصل ہوگیا۔

ہم نے ''کلس'' اور'' ریحان لی'' میں ایک دن اور ایک رات گزاردی اور وہاں سے بذریعہ جہاز ہم استنبول کے لیے روانہ ہوگئے۔عرفہ، انقرہ اور ریحان لی میں ہم نے شام کے بے بس مہاجرین کو بھی دیکھا اور ان کے کیمپ اور خیمہ بستیاں بھی دیکھیں اور ان کی بے بسی اور بے کسی کا مشاہدہ بھی کیا، ہزاروں یتیم بچے ان گھروں میں آباد ہیں، ایک گھر میں ہم نے دو ایسے بچے دیکھے جو عمر میں چھ چھ سال کے ہوں گے، جن کے جسم کے اعضاء بشارالاسد کی ظالم افواج کی کیمیکل بمباری سے شل ہو چکے تھے، ایک بچہ دیکھ رہا تھا، لیکن بول نہیں سکتا تھا، ان کے بازو اور انگلیاں ٹیڑھی ہوچکی تھیں، میں نے ایک بچے کے منہ میں ٹافی رکھی، لیکن وہ ٹافی کے چبانے اور چوسنے پر قادر نہیں تھا، دوسرا بچہ بھی بے بس پڑا ہوا تھا، ان کے قریب چند عورتیں تھیں جو اپنے گھروں اور شوہروں سے محروم تھیں، میں نے عربی میں ان کی تسلی کے لیے تھوڑا سا بیان بھی کیا، نہ معلوم بشارالاسد ظالم کے ظلم کا شکار ان عورتوں نے کچھ سنا اور سمجھا بھی یا وہ کسی کے سمجھنے سمجھانے سے عاجز تھیں۔

ان بے بس شامی مہاجرین کو ترکی حکومت نے خوب سنبھالا ہے، ان کے بچوں کی تعلیم کے لیے سکولوں کا انتظام بھی کیا ہے اور علماء نے دینی مدارس کا اہتمام بھی کیا ہے، لیکن یہ سب انتظامات ناکافی ہیں، خوراک کا معاملہ بھی بڑا پیچیدہ ہے، کیونکہ شام کے مہاجرین صرف ترکی میں لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں اور ترکی سرحد پر خیمہ بستی کا ایک بڑا شہر آباد ہے۔احباب نے بتایا کہ ان خیموں میں ستر لاکھ سے زیادہ مہاجرین بے یار و مددگار زندگی گزار رہے ہیں۔پاکستان کے الخبیب فاؤنڈیشن کا وہاں بہت بڑا کام جاری ہے، آئی ایچ ایچ کی ماتحتی میں بہت بڑا کام ہو رہا ہے، یہ ترکی کا اپنا امدادی ادارہ ہے۔ ہم نے کئی کیمپ ایسے دیکھے ہیں جن پر پاکستان کا جھنڈا نمایاں طور پر لہرا رہا تھا، جناب حاجی محمد احمد صاحب بھی مسلسل چاولوں کے کنٹینرز ان مہاجرین کے لیے پاکستان سے روانہ کررہے ہیں اور دیگر اجناس بھی بھیج رہے ہیں، مولانا مفتی ابولبابہ صاحب بھی ان مہاجرین میں بڑا کام کررہے ہیں، مولانا عبدالستار صاحب کے کام کا بھی وہاں پر چرچا ہم نے سنا ہے۔

چند ماہ قبل جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے ناظم تعلیمات حضرت مولانا امداد اللہ صاحب اور مولانا عاصم زکی صاحب نے بھی نقد کی صورت میں جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کی طرف سے ایک خطیر رقم ان مہاجرین تک پہنچائی ہے۔خبیب فاؤنڈیشن نے ایک مقام پر روٹیوں کا بڑا پلانٹ لگایا ہے جس میں روزانہ ایک لاکھ اسی ہزار روٹیاں تیار کی جاتی ہیں، اس کے قریب دیگر اجناس اور کپڑوں کا بڑا گودام ہے جو ان مہاجرین کے لیے ہے، ہاں! اس پر افسوس ہے کہ ہم نے حکومت

پاکستان کی طرف سے امداد کی کوئی ظاہری شکل نہیں دیکھی، ممکن ہے اندر اندر سے حکومت پاکستان کچھ کررہی ہوگی۔ عرب ممالک پر بھی افسوس ہوتا ہے کہ قطر کے علاوہ عرب ممالک اپنے ان بے بس عرب بھائیوں کی مدد میں دلچسپی نہیں لے رہے ہیں، ممکن ہے کسی نہ کسی جانب سے وہ امداد لے جارہے ہوں گے، مجھے بین الاقوامی ادارہ یو این او سے بھی شکایت ہے کہ اس نے ان شامی مہاجرین کے لیے کچھ نہ کیا، حالانکہ وہ قانونی طور پر مدد کا پابند ہے۔ میں اپنی اس تحریر کے ذریعہ سے حکومت پاکستان کے ہر ادارے اور ملک کی تمام سیاسی اور غیر سیاسی تنظیموں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ ان شامی مہاجرین کی بھرپور انداز سے مدد کریں، یہ مہاجرین زکوۃ اور صدقات کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ پاکستان کی مساجد کے ائمہ اور خطباء پر اسلامی، انسانی اور اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ان مہاجرین کی مدد کے لیے اپنی مساجد اور سوسائٹیوں کے ذریعہ بھرپور تعاون کی ترتیب بنائیں۔

ترکی کے بڑے شہر استنبول میں ہم نے چار دن گزارے، ہم ایک ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ قریب میں سلطان محمد فاتح کی مسجد میں ہم نماز پڑھتے تھے۔ استنبول کے اہم مقامات سے ایک مقام تو حضرت ابوایوب انصاریؓ کی قبر مبارک ہے، ایک بہت بڑے درخت کے نیچے یہ قبر واقع ہے، قبر کے نشانات نہیں ہیں، صرف ایک ہموار زمین ہے' جس میں قبر ہے، آپ کے دیگر ساتھی بھی وہاں مدفون ہیں، ان کی بنی ہوئی قبریں ہیں، لوگوں کا بہت ہجوم اور رش لگا رہتا ہے۔ استنبول میں قیام کے دوران ہم پینورامہ میوزیم دیکھنے کے لیے بھی گئے، اس میوزیم میں داخل ہونے پر ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے، اس میوزیم کا ٹکٹ ترکی کے پندرہ لیرا میں ملتا ہے، اگر ایک لیرا کی قیمت پاکستانی تیس روپے لگائی جائے تو یہ ٹکٹ ساڑھے چار سو روپے کا ہوجاتا ہے۔

پینورامہ کے اس میوزیم میں سلطان محمد فاتح کی جنگوں کا وہ نقشہ ہے جس کا تعلق دیکھنے سے ہے، اس کو تحریر میں لانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے، یہ جنگی منظرنامہ مجسموں اور تصویروں کی مدد سے پیش کیا گیا ہے، جس کی شرعی وفقہی حیثیت اپنی جگہ بے غبار ہے، یہاں تعارفی تاریخ کے طور پر بطور حکایت نقل کرتے ہیں، اس میوزیم میں ایک طرف سلطان محمد فاتح کی فوج دیوہیکل گھوڑوں پر سوار ہے، خود سلطان فاتح ایک عظیم الشان سفید گھوڑے پر سوار ہیں، سرخ رنگ کا بڑا جبہ زیب تن کیا ہوا ہے اور بڑی سفید گول پگڑی سر پر ہے، کھلے میدان میں مجاہدین کے بیچ میں گھوڑے کو نصاریٰ کی طرف موڑ رہے ہیں، ان کی فوج بھی گھوڑوں پر سوار ہے، سامنے بہت بڑی اونچی فصیل اور دیوار ہے جو نصاری کے بڑے گرجے کے اردگرد بنائی گئی ہے، اندر بہت بڑا اگرجا ہے جو اس وقت دنیا کا سب سے بڑا اگرجا تھا، دوسرا اگرجا روم میں تھا۔ دنیا میں عیسائیوں کے یہی دو گرجے مرکزی حیثیت رکھتے تھے اور عیسائی مذہب

اسی پر قائم تھا، اس گرجے کی فصیل کئی میلوں پر پھیلی ہوئی ہے، فصیل پر چڑھنے کے لیے مسلمان مجاہدین سیڑھی کے ذریعہ سے چڑھنے کی کوشش کرتے ہیں تو اوپر سے عیسائی تیر برساتے ہیں، مسلمان شہید ہوجاتے ہیں، لیکن پیچھے نہیں ہٹتے ہیں، ان کے گھوڑے جس طرح دیوہیکل جسم والے ہیں، اسی طرح یہ مجاہدین بھی بڑے بڑے قد وقامت کے مالک ہیں، پیدل فوج بھی پیچھے قطار میں ہزاروں کی تعداد میں تیار کھڑی دکھائی گئی ہے، سب کی بڑی بڑی پگڑیاں ہیں، توپ کے گولے اتنے موٹے موٹے ہیں کہ دونوں ہاتھوں کا دائرہ بنا کر بھی اُن کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا، وہاں اس قدیم زمانے کی اصلی توپ بھی موجود ہے اور اصلی گولے بھی موجود ہیں، جب آدمی وہاں کھڑا ہوکر جنگ کا نقشہ دیکھتا ہے تو جنگ کے موقع کا خیال گزرنے لگتا ہے، گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں آتی ہیں اور توپ کے گولے چھوڑنے اور آگ پھینکنے کا پورا نظارہ سامنے ہوتا ہے، قلعہ کی فصیل پر جب توپ سے بارود کا گولہ جا گرتا ہے تو قلعہ کا ایک حصہ ٹوٹ جاتا ہے، فصیل کے اوپر عیسائی کھڑے ہیں اور لمبے لمبے تیروں سے مسلمانوں کو نشانہ بنا رہے ہیں، ایک مسلمان شہید کے سینہ میں تیر ایسا پیوست نظر آتا ہے جو بالکل سیدھا کھڑا ہے اور مسلمان شہید پڑا ہے، بے شمار مسلمان شہید پڑے ہوئے ہیں اور ان سے تازہ تازہ خون بہہ رہا ہے، مجاہدین اپنے زخمی ساتھیوں کو کندھوں پر اٹھا کر محفوظ مقام کی طرف لے جاتے ہیں اور خون سے لت پت ہوجاتے ہیں، وہاں میدان میں گھوڑے بھی زمین پر مرے ہوئے پڑے ہیں، اکثر تیروں سے زخمی ہیں اور آگ سے جلے ہوئے ہیں۔ بہرحال یہ عظیم جہاد کا ایسا منظر ہے کہ اگر مسلمان اس کو دیکھے تو جذبۂ جہاد سے دیوانہ ہوجائے گا اور اگر کافر دیکھے تو مسلمان ہوجائے گا۔

استنبول میں ہم نے شیخ محمود آفندی سے ان کے مکان پر ملاقات کی، وہ خود کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے مگر ضعف زدہ تھے، ترکی میں شیخ محمود آفندی ایک دینی سائبان کا درجہ رکھتے ہیں، ان کے مرید شریعت کے پابند ہیں اور لاکھوں میں ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ ان کے مرید عمدہ سفید عماموں اور لمبی قمیصوں میں ملبوس تھے، شیخ محمود آفندی نے تصوف اور اصلاحی مواعظ پر کئی کتابیں بھی لکھی ہیں، چند کتابیں ہمیں بھی بطور ہدیہ پیش کیں، پھر ہم نے ان کے قریب ایک دوسرے مقام پر شیخ محمد عوامہ سے ملاقات کی، کافی تفصیلی گفتگو ہوئی، یہ ایک بڑے علمی آدمی ہیں، بیس سال تک مدینہ منورہ میں رہے ہیں اور پھر شام چلے گئے، اصل میں یہ حلب کے باشندے ہیں، مگر شام کے برے احوال کی وجہ سے وہاں سے ہجرت کی اور یہاں ترکی میں آباد ہوگئے۔ یہ عبدالفتاح ابوغدہ کے شاگردوں میں سے ہیں، انہوں نے اپنی مجلس میں شیخ زاہد الکوثری رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ کیا اور محدث العصر حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ بھی کیا، انہوں نے عطیہ میں مجھے اپنی کتابیں دیں اور بہت محبت کا اظہار کیا۔

استنبول میں مجمع البحرین کے مقام پر ایک پہاڑی کے اوپر حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کی قبر ہے، ہم نے جب وہاں حاضری دی تو بہت لمبی قبر نظر آئی، اگر چہ ہموار زمین میں قبر کے نشانات نہیں تھے، مگر یہ نظر آرہا تھا کہ قبر بیت اللہ کی سمت میں نہیں تھی، مجھے ابتداء میں شک ہوا کہ اتنی لمبی قبر کیسی ہے تو ایک صاحب نے کہا کہ ان لوگوں کی عادت تھی کہ نبی کی قبر بہت لمبی بنایا کرتے تھے۔ پھر میں نے اشکال ظاہر کیا کہ یہ قبر قبلہ رخ کیوں نہیں ہے؟ تو بتانے والے واقف کار آدمی نے کہا کہ یہ بیت المقدس کی طرف ہے، تب مجھے یقین آ گیا کہ یہی حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کی قبر ہے، پھر میں نے کہا کہ حضرت موسیٰ اور حضرت یوشع بن نون علیہما السلام تو مجمع البحرین میں آئے تھے، یہاں مجمع البحرین کہاں ہے؟ تو ایک ساتھی مجھے کچھ آگے کی طرف لے گیا اور کہا: وہ سامنے دیکھیں! مجمع البحرین ہے، ایک طرف سے بحر اسود آرہا ہے اور دوسری طرف سے بحر مرمرہ آرہا ہے، دونوں کے ملنے کا یہ وسیع سمندر مجمع البحرین کہلاتا ہے، یہ مشاہدہ اس لحاظ سے فرحت بخش تھا کہ اس کی بدولت قرآن کریم کے ایک مضمون کا ظاہری مصداق سمجھنے میں مدد ملی۔ مجمع البحرین کا تذکرہ قرآن کریم میں سورۂ کہف میں موجود ہے، میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ دوبارہ حاضری کے لیے حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کی قبر پر آیا اور خوب دعائیں کیں۔

استنبول میں ہم نے اس پہاڑ کو بھی دیکھا جس پر سلطان محمد فاتح رحمۃ اللہ علیہ نے خشکی میں کشتیاں چلائیں، قصہ اس طرح ہوا کہ استنبول میں عیسائیوں کے بڑے گرجے کے بڑے حصے کے اردگرد سمندر ہے، عیسائیوں نے سمندر میں بڑی بڑی زنجیریں باندھ لیں، تا کہ سلطان محمد فاتح سمندر کی طرف سے کشتیاں ڈال کر حملہ نہ کرسکے۔ عیسائیوں نے خشکی کی طرف سے پہرہ دینا شروع کردیا اور پہاڑ کی طرف سے سمندر میں کشتیاں آنے کا امکان نہیں تھا، اس لیے عیسائی اس طرف سے مطمئن تھے، سلطان محمد فاتحؒ کے مجاہدین نے تختے بچھا کر پہلے پہاڑ کی عقبی جانب سے کشتیاں اوپر پہاڑ تک پہنچادیں اور پھر سمندر کی جانب تختے بچھا کر اس پر پھسلنے والا مادہ لگادیا اور ایک دن میں تقریباً نوے کشتیاں سمندر میں اُتار دیں اور سمندر کو عبور کیا اور عیسائیوں کے قلعے اور گرجے کے سامنے آ کھڑے ہوگئے، عیسائیوں کے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا کہ اس طرف سے بھی کوئی حملہ کرسکتا ہے۔

اب جنگ کا وہی نقشہ قائم ہوگیا جس کا تذکرہ میں نے اس سے پہلے پنورامہ میوزیم کے تحت کیا ہے۔ آج کل اس پہاڑ کے کنارے پر بڑی سڑک گزرتی ہے جس پر مسلسل گاڑیاں رواں دواں ہیں اور دوسری طرف سمندر ہے، ایک عجیب منظر ہے جو جاذب نظر ہے۔

سلطان محمد فاتح رحمۃ اللہ علیہ کون تھے؟

سلطان محمد فاتح ۱۴۳۲عیسوی میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۴۸۱عیسوی میں زہرخورانی سے شہید

کردیئے گئے۔ترکی کے ہر شہر اور پوری مملکت میں سب سے زیادہ روشن نام سلطان محمد فاتح کا ہے۔ عوام الناس میں اتنے مقبول ہیں کہ دکانوں، فیکٹریوں، مساجد اور پارکوں کے نام فاتح کے نام سے رکھے ہوئے ہیں۔خرید وفروخت کی چھوٹی بڑی اشیاء پر فاتح نام بطور یادگار نظر آتا ہے، سلطان محمد فاتح کے تعارف کا اجمالی خلاصہ یہ ہے کہ خلافت عثمانیہ کے شاندار ماضی اور تابناک تاریخ میں تقریباً ۳۶ مشہور بادشاہ اور سلاطین گزرے ہیں، سب نے بھرپور جہاد کے لیے اپنی زندگیاں وقف کی تھیں اور تقریباً آدھی دنیا کو فتح کیا تھا، ان میں سلطان محمد فاتح سب سے زیادہ مشہور اور نمایاں گزرے ہیں، جن کو سرکاری اعزاز کے ساتھ فاتح کا لقب ملا ہے۔

خلافتِ عثمانیہ کے ۳۶ سلاطین میں سلطان محمد فاتح ساتویں نمبر کے سلطان اور خلیفہ گزرے ہیں، یہ سلطان مراد خان الثانی کے بیٹے ہیں، یہ نابغۂ روزگار سلطان ۱۴۳۱ عیسوی میں پیدا ہوئے تھے، گویا سلطان محمد خان فاتح آج سے تقریباً ساڑھے چھ سو سال پہلے گزرے ہیں، ۱۴۵۱ عیسوی میں یہ ترکی کے تخت خلافت پر تخت نشین ہوگئے تھے اور ۱۴۸۱ عیسوی تک تقریباً ۳۰ سال تک حکومت کی، ان کی پوری زندگی جہاد میں گزری ہے، گھمسان کی جنگوں میں صف اول میں رہتے تھے، ہمیشہ اپنے سفید گھوڑے پر میدان جنگ میں تلوار لہراتے ہوئے نظر آتے تھے، تخت نشین ہوتے ہی انہوں نے ''قارمان'' پر حملہ کرکے اسے فتح کیا، پھر دوسرے سال میں انہوں نے مشہور قلعہ اناضول کو فتح کیا اور پھر قلعہ رومیلی کا محاصرہ کیا اور بیزنطینی بادشاہت کے خلاف اعلان جہاد کیا، تیسرے سال میں سلطان محمد خان فاتح نے بیزنطینیہ کے مشہور قلعہ اور پایۂ تخت کی طرف پیش قدمی کی اور استنبول کے اطراف کا ہر طرف سے محاصرہ کیا اور سارے بری اور بحری راستے بند کردیئے۔

اسی سال یعنی ۱۴۵۳ عیسوی میں سلطان محمد فاتح نے خشکی پر کشتیاں چلاکر پہاڑ کی اونچائی سے نہایت حکمت کے ساتھ ایک دن میں تقریباً نوے کشتیاں سمندر میں اتاردیں اور اسی سال میں سمندر پار کیا اور آگے ایک خلیج پر آکر مورچے سنبھال لیے، اسی سال ۲۹ مئی ۱۴۵۳ عیسوی میں صبح کے وقت عیسائیوں سے گھمسان کی لڑائی شروع ہوگئی اور دیکھتے ہی دیکھتے استنبول فتح ہوگیا اور سلطان محمد فاتح استنبول میں فاتحانہ انداز سے داخل ہوگئے، بیزنطینی حکومت ختم ہوگئی اور عیسائیوں کا مشہور گرجا ''آیا صوفیہ'' مسلمانوں کے ہاتھوں میں آگیا، سلطان محمد فاتح نے اس کو مسجد میں تبدیل کیا اور استنبول کو خلافت عثمانیہ کا دار الخلافہ قرار دیا، ''آیا صوفیہ گرجا'' آج بھی ترکی میوزیم کے پاس موجود ہے، چوتھے سال میں سلطان محمد فاتح نے آس پاس کی ریاستوں سے صلح کے معاہدے کیے اور ''سربیا'' کی طرف جنگ کے لیے روانہ ہوگئے، سلطان محمد فاتح نے ۱۴۶۱ عیسوی میں البانیہ کے ساتھ صلح کا معاہدہ کیا

اور آگے بڑھ کر ’’طرابزون‘‘ اور ’’اماستر‘‘ پر شدید حملہ کیا اور وہاں کے بادشاہ اوزن حسن کو شکست دے دی، طرابزون کے فتح کرنے سے رومی بادشاہت کا خاتمہ ہوگیا، ۱۴۶۶ عیسوی میں البانیہ نے معاہدہ توڑا تو سلطان فاتح نے پلٹ کر البانیہ پر حملہ کر دیا اور کئی قلعے فتح کر کے ’’قونیہ‘‘ پر قبضہ کرلیا، ۱۴۸۰ عیسوی میں سلطان محمد فاتح نے ’’اوترانتو‘‘ پر حملہ کر دیا اور ’’اودس‘‘ قلعہ کا محاصرہ کیا، ۱۴۸۱ عیسوی میں عصر کے وقت سلطان محمد فاتح کو کسی کافر یا منافق نے زہر کھلا دی اور یہ عظیم مجاہد اُنچاس سال کی عمر میں شہید ہوگئے ، استنبول میں مسجد فاتح کے پاس سلطان محمد فاتح کی قبر ہے، اس طرح اسلام کے یہ عظیم غازی اور مجاہد تیس سالہ حکومت وخلافت کے بعد اللہ تعالیٰ کے جوار رحمت میں چلے گئے ۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

(بحوالہ السلاطین العثمانیون)

ترکی کے موجودہ حکمران طیب اردگان

ہم نے ترکی میں آج کل طیب اردگان کی مقبولیت کا ایک عجیب منظر دیکھا۔ استنبول میں ہم اپنی گاڑی میں بیٹھے ہوئے روڈ پر سفر کر رہے تھے کہ سامنے ایک ٹیکسی جارہی تھی، جس کے پچھلے شیشے پر ترکی میں کچھ لکھا ہوا تھا اور ایک نوجوان کی تصویر بھی لگی ہوئی تھی، ہماری گاڑی چلانے والا تیس سال سے ترکی میں قیام پذیر ہے، اس نے کہا کہ: اس ٹیکسی پر لکھا ہوا ہے کہ اس شخص کے خاندان کا کوئی بھی مرد یا عورت اگر اس ٹیکسی میں سفر کرے گا تو ان سے کرایہ نہیں لیا جائے گا۔

ہمارے ساتھی نے بتایا کہ یہ لڑکا ایک عام فوجی تھا، طیب اردگان کے خلاف فتح اللہ گولن نے امریکہ کی مدد سے جو بغاوت کی تھی، اس میں اس لڑکے کو اس فوجی استاذ نے فون پر کہا کہ: فوج کا دستہ لے کر ایک فوجی کرنل ایئرپورٹ پر قبضہ کے لیے آرہا ہے، اگر تم میرے شاگرد ہو تو تم پر میرا حق ہے کہ اس فوجی افسر کو ماردو، اس نے اس فوجی کرنل کو مارا تو بغاوت ناکام ہوگئی، لیکن مقتول کرنل کے ساتھیوں نے اس فوجی لڑکے کو بھی مار کر شہید کر دیا۔ اس ٹیکسی والے نے اس لڑکے سے محبت کی بنیاد پر اُس کے خاندان کو مفت سفر کی سہولت دینے کو اپنے لیے اعزاز سمجھا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ترکی کے عوام طیب اردگان سے کتنی محبت رکھتے ہیں۔ یہ جو کچھ میں نے لکھا ہے، یہ استنبول میں قاپ طوپی کے مشہور میوزیم کے علاوہ مشاہدات ہیں۔ قاپ طوپی کے مقدسات سے متعلق ان شاءاللہ! اس مضمون کے علاوہ کسی اور مضمون میں تحریر کروں گا، اللہ تعالیٰ اس کے لکھنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین یارب العالمین!

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

اسلام میں خیر خواہی کی تاکید

مفتی غلام مصطفیٰ رفیق
استاذ جامعہ بنوری ٹاؤن

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں، آپ کے والد کا اسم گرامی عبداللہ اور والدہ کا بجیلہ تھا، والدہ کی جانب نسبت کی بنا پر ''البجلی'' کہلاتے ہیں۔ ''سیر اعلام النبلاء'' میں ان کے تذکرے میں ہے کہ جب یہ مسجد نبوی تشریف لائے تو رسول اللہ ﷺ نے اپنی چادر مبارک اور بعض روایات کے مطابق تکیہ اُنہیں بیٹھنے کے لیے پیش فرمایا۔ حضرت جریر رضی اللہ عنہ اپنی قوم کے سردار بھی تھے، اس بنا پر بھی رسول اللہ ﷺ نے ان کے ساتھ اعزاز واکرام کا معاملہ فرمایا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مخاطب کرکے ارشاد فرمایا: ''**إذا أتاکم کریم قوم فأکرموہ**''...... ''جب کسی قوم کا سردار، معزز شخص تمہارے پاس آئے تو اس کا اکرام کرنا چاہیے۔'' (معارف الحدیث، کتاب المناقب والفضائل، ج:۸،ص:۴۴۶، ط: دارالاشاعت)

ان کے اس تذکرہ وتعارف سے مقصود وہ حدیث ذکر کرنا ہے جو انہوں نے جناب رسول اللہ ﷺ سے سنی اور زندگی بھر اُس حدیث مبارکہ پر عمل کو اپنا مشن بنایا۔ رسول اللہ ﷺ کی یہ خصوصیت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ''**جوامع الکلم**'' نصیب فرمائے تھے، یعنی کلمات اور الفاظ مختصر، مگر معانی انتہائے گہرے اور طویل۔ بخاری ومسلم کی روایت میں ارشاد ہے کہ: ''**أعطیت جوامع الکلم**'' کہ ''میری خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے جامع کلمات عطا فرمائے ہیں۔'' یعنی آپ ﷺ کا بول مختصر ہوتا تھا اور معانی بہت۔ چنانچہ حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''**بایعتُ رسولَ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم علٰی إقامِ الصلوۃ وإیتاءِ الزکوۃ والنصحِ لکُلّ مسلم۔**'' (مشکوۃ المصابیح، کتاب الآداب، باب الرحمۃ والشفقۃ علی الخلق، ص:۴۲۳، ط: قدیمی)

ترجمہ: ''میں نے رسولِ کریم ﷺ سے اس بات پر بیعت کی کہ پابندی کے ساتھ نماز پڑھوں گا، زکوٰۃ ادا کروں گا، اور ہر مسلمان کے حق میں خیر خواہی کروں گا۔''

نماز اور زکوٰۃ اسلام کے اہم ترین ارکان میں سے ہیں، اُن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے، اور ''خیر خواہی'' کے ضمن میں بندوں کے تمام حقوق آجاتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تین بار یہ ارشاد فرمایا: ''دین سراسر خیر خواہی کا نام ہے۔'' (سنن النسائی، کتاب البیعۃ، النصیحۃ

للامام، ج:۲،ص:۱۸۵،ط:قدیمی) نیز مسلم شریف میں حضرت تمیم داری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے:

''أن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم، قال: الدین النصیحۃ ، قلنا لمن؟ قال : لِلّٰہ ولکتابہٖ ولرسولہٖ ولأئمۃ المسلمین وعامتھم۔'' (صحیح مسلم، باب الدین النصیحۃ، ج:۱،ص:۵۴،ط:قدیمی)

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دین خیرخواہی کا نام ہے (یعنی نصیحت اور خیرخواہی اعمالِ دین میں سے افضل ترین عمل ہے یا نصیحت اور خیرخواہی دین کا ایک مہتم بالشان نصب العین ہے) ہم نے (یعنی صحابہؓ نے) پوچھا کہ یہ نصیحت اور خیرخواہی کس کے حق میں کرنی چاہیے؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ: اللہ کے لیے، اللہ کی کتاب کے لیے، اللہ کے رسول کے لیے، مسلمانوں کے ائمہ کے لیے اور تمام مسلمانوں کے لیے۔''

ان احادیثِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ دینِ اسلام فقط عبادات یا ذکر واذکار یا وظائف کا نام نہیں، بلکہ بندوں کے حقوق، ان کے ساتھ خیرخواہی، ان کے لیے خیر اور بھلائی کا چاہنا، یہ بھی دینِ اسلام میں شامل اور اس کا حصہ ہے۔ لوگوں کی تذلیل کرنا یا اُن کے نقصان کے درپے ہونا یا اُن کے ساتھ بدخواہی کا معاملہ رکھنا یہ ایمان کی شان کے خلاف ہے۔

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا روایت صاحبِ مشکوٰۃ نے ''کتاب الآداب، باب الرحمۃ والشفقۃ علی الخلق'' کے تحت ذکر کی ہے۔ مشکوٰۃ المصابیح کی شرح ''مظاہرحق'' میں مذکورہ روایت کے تحت علامہ نواب قطب الدین خان دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے متعلق ایک عجیب واقعہ لکھا ہے، یہ واقعہ اس بات پر دلالت کرتا ہے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جب اپنے پیغمبر ﷺ سے کسی نصیحت، کسی حکم کو سنتے تو ساری عمر اس حکم کو مدنظر رکھتے اور ہر موڑ پر اس کا لحاظ کرتے ہوئے زندگی گزارتے تھے۔ ساری عمر اپنے دامن سے اس نصیحت کو چمٹائے رکھتے اور ذرہ برابر اس سے اِعراض نہ فرماتے، چنانچہ صاحبِ مظاہرِحق لکھتے ہیں:

''ایک مرتبہ حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے ایک گھوڑا تین سو درہم کے عوض خرید کیا، انہوں نے بیچنے والے سے کہا کہ: تمہارا یہ گھوڑا تو تین سو درہم سے زیادہ قیمت کا ہے، تم اس کی قیمت چار سو درہم لوگے؟ اس نے کہا: ابن عبداللہ! تمہاری مرضی پر موقوف ہے۔ انہوں نے کہا کہ: یہ گھوڑا تو چار سو درہم سے بھی زیادہ کا معلوم ہوتا ہے، تم کیا اس کی قیمت پانچ سو درہم لینا پسند کروگے؟ وہ اسی طرح اس کی قیمت سوسو درہم بڑھاتے گئے اور آخرکار انہوں نے اس گھوڑے کی قیمت میں آٹھ سو درہم ادا کیے۔ جب لوگوں نے ان سے گھوڑے کی قیمت بڑھانے کا سبب پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ: اصل بات یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ بیعت کی تھی کہ ہر مسلمان سے خیرخواہی کروں گا (چنانچہ جب میں نے دیکھا کہ اس گھوڑے کا مالک وہ قیمت طلب نہیں کررہا جو حقیقت میں ہونی چاہیے تو میں نے اس کی خیرخواہی کے پیشِ نظر اس کو زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کی)۔'' (مظاہرحق شرح مشکوٰۃ المصابیح، ج:۴،ص:۵۰۰،ط:دارالاشاعت کراچی)

حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ سے منقول حدیث کی تشریح علماء نے یہ لکھی ہے کہ:

''اللہ تعالیٰ کے حق میں خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر ایمان لائے، اللہ کی وحدانیت وحاکمیت کا اعتقاد رکھے، اس کی ذات وصفات میں کسی غیر کو شریک نہ کرے، اس کی عبادت اخلاصِ نیت کے ساتھ کرے، اور اس کے اوامر ونواہی کی اطاعت و فرمانبرداری کرے، اس کی نعمتوں کا اقرار واعتراف کرے اور اس کا شکر ادا کرے اور اس کے نیک بندوں سے محبت کرے اور بدکار سرکش بندوں سے نفرت کرے۔

اللہ کی کتاب کے حق میں خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کا عقیدہ رکھے کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے، اس میں جو کچھ لکھا ہے اُسے سمجھے اور اس پر ہر حالت میں عمل کرے، تجوید وترتیل اور غور وفکر کے ساتھ اس کی تلاوت کرے اور اس کی تعظیم واحترام میں کوئی کوتاہی نہ کرے۔

اللہ کے رسول ﷺ کے حق میں خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ سچے دل سے یہ گواہی دے کہ وہ اللہ کے رسول اور اس کے پیغمبر ہیں، ان کی نبوت پر ایمان لائے اور انہیں خاتم الانبیاء مانے، وہ اللہ کی طرف سے جو پیغام پہنچائیں اور جو احکامات دیں ان کو قبول کرے اور ان کی اطاعت وفرمانبرداری کرے، ان کو اپنی جان، اپنی اولاد، اپنے ماں باپ اور تمام لوگوں سے زیادہ عزیز رکھے، ان کے اہل بیتؓ اور ان کے صحابہ رضی اللہ عنہم سے محبت رکھے اور ان کی سنت پر عمل کرے۔

مسلمانوں کے اماموں کے حق میں خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اسلامی حکومت کی سربراہی کر رہا ہو اس کے ساتھ وفاداری کو قائم رکھے، احکام وقوانین کی بے جا طور پر خلاف ورزی کر کے ان کے نظمِ حکومت میں خلل وابتری پیدا نہ کرے، اچھی باتوں میں ان کی پیروی کرے اور بری باتوں میں ان کی اطاعت سے اجتناب کرے، اگر وہ اسلام اور اپنی عوام کے حقوق کی ادائیگی میں غفلت وکوتاہی کا شکار ہوں تو ان کو مناسب اور جائز طریقوں سے متنبہ کرے اور ان کے خلاف بغاوت کا علم بلند نہ کرے، اگرچہ وہ کوئی ظلم ہی کیوں نہ کریں، نیز علماء کی -جو مسلمانوں کے علمی ودینی رہنما ہوتے ہیں- عزت واحترام کرے، شرعی احکام اور دینی مسائل میں وہ قرآن وسنت کے مطابق جو کچھ کہیں اس کو قبول کرے اور اس پر عمل کرے، ان کی اچھی باتوں اور ان کے نیک اعمال کی پیروی کرے۔

اور تمام مسلمانوں کے حق میں خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ ان کی دینی، دنیاوی خیر وبھلائی کا طالب رہے، ان کو دین کی تبلیغ کرے، ان کو دنیا کے اس راستہ پر چلانے کی کوشش کرے جس میں ان کی بھلائی ہو اور اُن کو کسی بھی طرح نقصان پہنچانے کی بجائے نفع پہنچانے کی سعی کرے۔ رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث بھی ''جوامع الکلم'' میں سے ہے، اس کے مختصر الفاظ حقیقت میں دین ودنیا کی تمام بھلائیوں اور سعادتوں پر حاوی ہیں اور تمام علوم اولین وآخرین اس چھوٹی سی حدیث میں مندرج ہیں۔''

(مظاہر حق شرح مشکوۃ المصابیح، ج:۴، ص:۴۹۹، ط: دارالاشاعت کراچی)

تاریخِ اسلامی میں دروغ گوراویوں کا کردار

اور تدوینِ جدید کی ضرورت

مفتی ابوالخیر عارف محمود، دار التصنیف مدرسہ فاروقیہ، گلگت

تاریخ کا لغوی مفہوم

لغت میں ''تاریخ'' وقت سے آگاہ کرنے کو کہتے ہیں (یعنی کسی چیز کے واقع ہونے کا وقت بتانا)۔ (۱)

اہلِ لغت کہتے ہیں کہ: ''أرختُ الکتاب و رختُهٗ''یعنی''میں نے لکھنے کا وقت ظاہر کیا۔''

علامہ اسماعیل بن حماد الجوہری (المتوفی: ۳۹۳ھ) فرماتے ہیں کہ: تاریخ اور توریخ دونوں کے معنی وقت سے آگاہ کرنا ہیں، چناں چہ اس کے لیے''أرختُ'' بھی کہا جاتا ہے اور''ورختُ'' بھی۔ (۲)

بعض اہلِ لغت کہتے ہیں کہ: تاریخ ''أرخ''(بضم الھمزۃ و کسرھا) سے مشتق ہے، ''أرخ'' وحشی گائے (نیل گائے) کے مادہ بچہ کو کہتے ہیں، اور اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جس طرح بچہ نومولود ہوتا ہے، اسی طرح تاریخ بھی ایک نوایجاد شئے ہے۔ (۳)

تاریخ کا اصطلاحی مفہوم

تاریخ کی اصطلاحی تعریف میں بڑی بڑی موشگافیاں کی گئی ہیں، یہاں بعض کا تذکرہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

۱:...... اصطلاح میں تاریخ اس وقت کے بتانے کا نام ہے جس سے راویوں اور ائمہ کے سارے احوال وابستہ ہوتے ہیں، یعنی اُن کی ولادت، وفات، ان کی صحت وعقل، طلبِ علم کے لیے سفر، حج، اُن کا حافظہ، ضبط واتقان، ان کا عادل ہونا، قابلِ جرح ہونا، وغیرہ تمام باتیں جن کا تعلق ان کے احوال کی چھان بین سے ہو۔

۲:...... یا اصطلاح میں تاریخ اس علم کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ بادشاہوں، فاتحوں اور مشہور شخصیات کے احوال، گزرے ہوئے زمانہ کے بڑے اور عظیم الشان واقعات وحوادث، زمانہ

گزشتہ کی تمدن، معاشرت، اخلاق وغیرہ سے واقفیت حاصل کی جاسکے۔

۳:...... بعض حضرات نے کہا کہ پھر اس مفہوم کو وسعت دے کر وہ سارے امور بھی اس سے ملحق کردیئے گئے جو بڑے واقعات وحوادث سے متعلق ہوں۔ جنگوں، امورِ سلطنت، تہذیب وتمدن، حکومتوں کے قیام، عروج وزوال، رفاہِ عامہ کے کاموں وغیرہ کی حکایت کو بھی تاریخ کہا گیا ہے۔

خلاصہ اور نتیجہ ان تمام اقوال کا یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ جو حالات و واقعات بقیدِ وقت لکھے جاتے ہیں، ان کو تاریخ کہتے ہیں۔ (۴)

تاریخ کی ضرورت وفوائد

تاریخ سے گزشتہ اقوام کے عروج وزوال، تعمیر وتخریب کے احوال معلوم ہوتے ہیں، جس سے آئندہ نسلوں کے لیے کافی عبرت کا سامان میسر آتا ہے، حوصلہ بلند ہوتا ہے، دانائی وبصیرت حاصل ہوتی ہے اور دل ودماغ میں تازگی ونشو نما کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ غرض تاریخ اس کائنات کا پسِ منظر بھی ہے اور پیشِ منظر بھی، اسی پر بس نہیں بلکہ اس سے آئندہ کے لیے لائحہ عمل طے کرنے میں بھی خوب معاونت حاصل ہوتی ہے۔ (۵)

بہترین مؤرخ کون؟

بہترین مؤرخ وہ ہوتا ہے جو سالم العقیدہ اور پاک مذہب ہو، جو کچھ لکھے وہ بیانِ واقع ہو۔ نہ کسی بات کو چھپائے، نہ کوئی غلط بات اپنی طرف سے بڑھائے۔ مؤرخ کے لیے ضروری ہے وہ امانت ودیانت میں ممتاز ہو۔ ذہین، نکتہ رس، منصف مزاج ہونے کے ساتھ ادیب اور قادرالکلام بھی ہو۔ سیاسی، مسلکی وابستگی وتعصب سے پاک ہو۔ امراء وحکام کی خوشنودی اور مادی منافع اور جاہ ومنزلت کی خاطر حقائق کو توڑ مروڑ کر کے ضمیر وقلم فروشی کا مرتکب نہ ہو۔ تائیدی اسباب کے مختلف احتمالات میں پہلے سے کسی ایک جانب کو متعین نہ کرے، انصاف کے ساتھ صحیح اور درست سمت کو اختیار کرے، وغیرہ۔ (۶)

شرائطِ مؤرخ

علامہ تاج الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ ''قاعدة في المؤرخين نافعة جداً'' کے عنوان سے تحریر فرماتے ہیں کہ: اہل تاریخ بعض دفعہ کچھ لوگوں کو ان کے مقام ومرتبہ سے گرا کر اور کچھ کو اونچا کر کے پیش کرتے ہیں، یہ یا تو تعصب، یا جہل، یا غیر موثوق راوی کے نقل پر اعتمادِ محض وغیرہ کی وجہ سے ہوتا ہے۔ شاید ہی کسی تاریخ کو آپ اس سے خالی پائیں گے...... اس بارے میں صحیح وصائب رائے ہمارے نزدیک یہ ہے کہ چند شرائط کے بغیر مؤرخین کی نہ تو کسی مدح کو قبول کیا جائے اور نہ ہی جرح کو، وہ شرائط یہ ہیں: ۱:...... مؤرخ صادق ہو۔ ۲:...... روایت باللفظ پر اعتماد کیا ہو، نہ کہ

روایت بالمعنی پر۔ ۳:......اس کی نقل کردہ روایت مجلسِ مذاکرہ میں سن کر بعد میں نہ لکھی گئی ہو۔ ۴:...... جس سے نقل کر رہا ہو، اس کے نام کی صراحت کرے۔ ۵:...... اپنی طرف سے کسی کے حالات بیان نہ کرے۔ ۶:......تراجم میں کثرتِ نقل کو اختیار نہ کرے۔ ۷:......مترجم لۂ کے علمی اور دینی حالات سے پوری طرح واقف ہو۔ ۸:......حسنِ عبارت کا مالک ہو اور الفاظ کے مدلولات سے واقف ہو۔ ۹:......حسنِ تصور والا ہو، یہاں تک کہ مترجم لۂ کے تمام حالات اس کے سامنے ہوں، اس کے بارے میں ایسی عبارت لائے جو نہ اُسے اس کے حقیقی مقام سے اونچا کرے اور نہ گرادے۔ ۱۰:...... ہویٰ پرستی کا شکار نہ ہو کہ وہ اس کو اپنی محبوب شخصیت کی مدح میں اطناب اور دیگر کے بارے میں تقصیر پر مجبور کرے، یا تو ہویٰ سے بالکل پاک ہو یا اس میں ایسا عدل ہو جو اس کے ہویٰ کو مغلوب کر کے انصاف پر مجبور کرے۔ (۷)

تاریخِ قرونِ ثلاثہ

اس تمہیدی گفتگو کے بعد ہم اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹ آتے ہیں، ہماری تحریر کا مقصد قرونِ ثلاثہ سے متعلق تاریخ کی تدوین اور دروغ گوراویوں کے کردار اور تاریخ کی تدوینِ جدید کی ضرورت کے متعلق بحث کرنا ہے۔ اگرچہ تدوین حدیث بھی تاریخ ہی کا ایک حصہ ہے، مگر وہ ہمارا موضوعِ بحث نہیں، اس سے متعلق سرسری اشاروں پر اکتفا کریں گے۔ اسلام میں تاریخ نویسی کی ابتدا تو حضور اکرم ﷺ کے زمانۂ مبارک سے ہوئی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کے سرایا وغزوات کے حالات نہ صرف اپنے سینوں میں محفوظ رکھتے تھے، بلکہ اپنی اولاد کو بھی اُنہیں یاد کرنے کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ لیکن باقاعدہ سے تمام اخبار و وقائع کو بصورتِ تاریخ مدون کرنے کا کام دوسری صدی ہجری میں بنوعباس کے عہدِ حکومت میں شروع ہوا۔ ابتداء میں واقعات کو بیان کرنے کے لیے سند کا اہتمام کیا گیا، یہاں تک کہ اشعار بھی سند کے ساتھ بیان کیے جاتے تھے، چناں چہ ''تاریخِ طبری'' اور ''کتاب الأغانی'' اس کا مظہر ہیں، لیکن یہ واضح رہے عام اخبار و وقائع اور اشعار کے راویوں کی بابت بحث وتمحیص اور تحقیق کے باب میں وہ اہتمام اور شدت نہیں برتی گئی جو روایاتِ حدیث کے متعلق بحث وتمحیص اور تحقیق کے باب میں برتی گئی۔

تدوینِ تاریخ میں کارفرما ایک نفسیاتی ضابطہ

یہ بات تو ہر عام وخاص پر واضح ہے کہ انسانی تاریخ میں جب بھی ایک قوم وقبیلہ یا جماعت وپارٹی کی حکومت واقتدار کو ختم کر کے دوسری مقابل قوم وقبیلہ یا جماعت وپارٹی برسرِاقتدار آتی ہے تو وہ اپنے پیش روحکمرانوں کی تمام خوبیوں، محاسن، اور تعمیری کاموں کو بھی خامیاں، برائیاں اور تخریب باور کروانے کے لیے پوری حکومتی مشینری کے ساتھ مل کر ایڑی چوٹی کا زور لگاتی ہے۔

تدوینِ تاریخ اسلامی کے وقت بھی یہ نفسیاتی ضابطہ کارفرما رہا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان مصالحت کے بعد سے تقریباً ۱۳۲ھ تک عالم اسلام پر بنواُمیہ کی حکومت رہی، پھر اس کے بعد ۱۳۲ھ موافق ۷۴۹ء بنوعباس کے ایک شخص ابوالعباس السفاح نے بنواُمیہ کی حکومت ختم کرکے بنوعباس کی حکومت کی داغ بیل ڈالی۔

یہ بات بھی بالکل عیاں ہے کہ بنوعباس اور بنواُمیہ کے درمیان زمانہ قدیم سے خاندانی و قبائلی عصبیت کے تحت سخت مخالفت تھی، لہٰذا جب بنوعباس کے دورِحکومت میں تاریخ کی تدوین شروع ہوئی تو عام طور سے تاریخی وقائع وحوادث کومرتب کرنے میں اسی نفسیاتی ضابطہ کو پیشِ نظر رکھا گیا، بلکہ بعض مؤرخین نے حکومتی ظلم وستم سے بچنے یا حکامِ وقت کی خوشنودی کی خاطر اور اپنی معاشی و تمدنی حالت کومستحکم کرنے کے لیے مذکورہ بالا طرز ہی اختیار کیا۔

علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی گواہی

قریبی دور کے ایک مشہور مؤرخ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف ''**الإنتقاد علی التمدن الإسلامي**'' میں اسلامی تاریخ کی ابتدائی تدوین کا بہترین جائزہ پیش کیا ہے، چناں چہ علامہ صاحبؒ نے لکھا ہے:

''اسلامی تاریخ کے مؤرخین عموماً بنوعباس کے عہد میں (پیدا) ہوئے اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ عباسیوں کے عہد میں بنواُمیہ کی خوبی کی کوئی چیز (بھی) اتفاقاً صادر ہوجاتی تو اس کے قائل کو کئی قسم کی ایذاؤں کا سامنا کرنا پڑتا اور ہتکِ عزت کے علاوہ ناموافق انجام سے بھی دوچار ہونا پڑتا تھا۔ دفترِ تاریخ میں اس قسم کی کئی مثالیں موجود ہیں۔'' (۸)

راویوں کا نظریاتی کردار

اس کے علاوہ تاریخی واقعات کونقل کرنے والے راویوں کے نظریات اور مذہبی رجحانات نے بھی ان واقعات کو بیان کرنے اوراس کے لیے اختیار کی جانے والی تعبیر میں مرکزی کردارادا کیا، خصوصاً جب اُنہیں روایت بالمعنی کی عام اجازت بھی حاصل تھی، چناں چہ بہت سارے گمراہ عقائد وافکار کے حامل راویوں نے قرونِ ثلاثہ سے متعلق واقعات کو اپنے مذہبی رجحانات ونظریاتی افکار کے تحت حقائق کونظرانداز کرکے اس طرح بیان کیا کہ اس سے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وتابعینؒ کے بارے میں بہت سارے مطاعن ومثالب پیدا کیے گئے۔

دروغ گوراویوں کے ظہور کے اسباب واہداف

قرونِ ثلاثہ میں خاص طور سے تدوینِ تاریخ کے زمانہ میں حدیث وتاریخ کے سلسلہ میں دروغ گوراویوں کی ایک بڑی تعداد ظاہر ہوئی، ایک محتاط اندازے کے مطابق ساڑھے تین سو سے

زائد دروغ گوراوی ہیں، جنہوں نے ہمارے صاف وشفاف علمی اور تاریخی ورثہ کو اپنی دروغ گوئیوں سے گدلا کرڈالا، بلکہ بسا اوقات ناپاک بھی کردیا ہے، وہ کون سے اسباب تھے جنہوں نے ان لوگوں کو دروغ گوئی پر مجبور کیا؟! اوران کی اس دروغ گوئی اور کذب کے پس پردہ کیا اہداف ومقاصد تھے؟! بعض کی طرف تو ہم اشارہ کرچکے ہیں، یہاں چند اہم اسباب واہداف کا تذکرہ کرتے ہیں۔

قارئین کرام! اگر آپ قرونِ ثلاثہ کی تاریخ کا باریک بینی سے جائزہ لیں گے تو تدوین کے اس زمانہ میں جھوٹ وکذب کے ظاہر ہونے کے اسباب واہداف میں تداخل پائیں گے۔ بسا اوقات ایک ہی واقعہ میں سبب اور ہدف دونوں پائے جائیں گے۔ اگر آپ نفس واقعہ کی طرف دیکھیں گے تو آپ کو اس کا سبب نظر آئے گا، لیکن اسی واقعہ پر نتیجہ کے اعتبار سے غور کیا جائے تو اس کا ایک ہدف وغرض بھی سامنے آئے گی۔ غرض دروغ گوئی وکذب کے بعض ایسے گہرے اور بنیادی اور واضح اسباب ہیں، جن کی وجہ سے قرونِ ثلاثہ کے دوران عام طور سے اور تدوینِ تاریخ کے وقت خاص طور سے دروغ گوئی نے جڑ پکڑ لی تھی۔

دروغ گوئی کے اہم اور بنیادی اسباب

ویسے تو دروغ گوئی وکذب کے اسباب کثیر تعداد میں ہیں، ہم یہاں صرف چند اہم اور بنیادی اسباب کے ذکر پر اکتفا کریں گے:

۱:......سیاسی اختلافات

بنیادی طور پر سیاسی اختلافات ہی وہ اہم سبب ہے جس نے اُمت مسلمہ کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے مختلف باہم مقابل فرقوں میں بانٹ کر ایک دوسرے کے دست وگریباں اور خون کا پیاسا بنادیا۔ سیاسی اختلافات کی ابتداء تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کے آخری ایام میں ہوئی اور بالآخر ۱۳۲ھ میں ابوالعباس السفاح کے ہاتھوں بنواُمیہ کے اقتدار کے خاتمہ کی شکل میں اس کے خون آشام نتائج ظاہر ہونے لگے اور عالم اسلام کی موجودہ صورت حال اس بات پر دلالت کررہی ہے کہ اس کی خون آشامی اب بھی اُمتِ مسلمہ کو گھیرے ہوئے ہے۔

۲:......فکری اور مذہبی گمراہی وبے اعتدالی

فکری اور مذہبی گمراہی نے اسی سیاسی فتنہ کے بطن سے جنم لیا، اس اندھے سیاسی فتنہ نے فکری اور مذہبی انحراف کو مزید اوندھا اور گہرا کرکے نہ صرف اُسے بنیاد فراہم کی، بلکہ اس کا دفاع کرکے اُسے ایک مقدس، شرعی ومذہبی رنگ دے دیا، جیسا کہ صراطِ مستقیم سے انحراف کرنے والے، اسلام کی طرف منسوب بہت سارے گمراہ فرقوں خوارج وروافض وغیرہ کا حال یہی ہے کہ دونوں

نے سیاسی فتنہ کے بطن سے جنم لے کر اسی کی گود میں پرورش پائی اور اس کی تائید سے صراطِ مستقیم سے منحرف ان فرقوں نے ایک مقدس مذہبی رنگ کا لبادہ اوڑھ لیا، جن کی قد است کے پسِ پردہ اُمت مسلمہ کو گزشتہ تیرہ صدیوں سے لہولہان کیا جارہا ہے۔

۳:...... باطنی امراض (کفر ونفاق اور زندقہ)

باقی رہی بات امراضِ باطنی کی، جیسا کہ کفر، نفاق، زندقہ، حسد، کینہ، دنیا کی محبت وحرص وغیرہ، یہ وہ اسباب ہیں جنہوں نے بہت سارے لوگوں کو دروغ گوئی، اس میں مہارت و امتیاز حاصل کرنے پر اُبھارا اور مجبور کیا، پھر اس کے برے اور زہریلے اثرات میں مزید اضافہ اس وقت ہوا جب ان امراضِ باطنی اور سیاسی و مذہبی اختلافات میں امتزاج ہوا۔ غرض یہی وہ مرکزی اور گہرے و بنیادی اسباب تھے جنہوں نے ان دروغ گوراویوں کے لیے زمین ہموار کی اور فضا و ماحول کو سازگار بنایا، جس کی وجہ سے وہ نہ صرف جھوٹ و دروغ گوئی کی طرف متوجہ ہوئے، بلکہ اس میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی سعی نامسعود کی، تاکہ اپنے زعم باطل کے مطابق اس دروغ گوئی کے سہارے اپنے مذہب کی خدمت، مصالح کے حصول اور شہوات کی تکمیل کر سکیں۔

۴:......مخصوص فکری و مذہبی فرقہ کی تائید ونصرت

دروغ گوئی و کذب کے ظاہر ہونے کے اسباب میں ایک سبب صراطِ مستقیم سے منحرف رہنے والے مخصوص فکری و مذہبی فرقہ کی تائید ونصرت بھی ہے۔ علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ:

''دروغ گو اور کذّاب احمد بن عبداللہ جویباری فرقہ کرامیہ کی نصرت و دفاع کی خاطر محمد بن کرام کے لیے احادیث گھڑا کرتا تھا اور محمد بن کرام انہیں اپنی کتابوں میں ذکر کرتا تھا۔'' (۹)

اس طرح دروغ گو و کذّاب قاضی محمد بن عثمان نصیبی روافض کی تائید ونصرت کی خاطر احادیث گھڑا کرتا تھا۔ اور ابو جارود بن منذر کوفی مثالبِ صحابہؓ میں احادیث وضع کیا کرتا تھا۔ عبدالرحمٰن بن خراشی شیعی کا بھی یہی وطیرہ تھا، اس نے حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کے مزعومہ مثالب میں دو رسالے تحریر کر کے روافض کے ایک بڑے پیشوا کی خدمت میں پیش کیا تو اس نے اُسے دو ہزار درہم انعام میں دیے۔ (۱۰)

قارئین کرام! غور فرمائیں کہ مذکورہ بالا تینوں افراد کا ہدف و مقصد وضع حدیث سے صرف اپنے مخصوص فرقہ کے فکری و اعتقادی افکار کی تائید کے علاوہ کچھ نہیں، یہ لوگ صرف انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد بالاتفاق خیر البشر و افضل البشر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خلاف زبان درازی اور دلی کینہ کے اظہار کی غرض سے دروغ گوئی کیا کرتے تھے۔ روافض نے اہل بیتؓ و حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تین ہزار کے قریب جعلی احادیث وضع کی ہیں۔ (۱۱)

۵:......ترغیب وترہیب

دروغ گوئی کے اہداف میں ایک ہدف لوگوں کو دین کی ترغیب دینا اوران کے دلوں کو نرم کرنا اوراپنے مزعومہ نظریہ کے مطابق لوگوں کو اجر کی امید دلانا اور گناہ سے روکنے کے لیے ترہیب بھی تھا، جیسا کہ بعض جاہل اور غالی صوفی قسم کے لوگوں نے اس قبیح فعل کا ارتکاب کیا۔

۶:......مادی ومعاشی فوائد کا حصول

دروغ گوئی کے مرکزی اہداف واسباب میں ایک بڑا اور بنیادی سبب وہدف جاہل عوام کو اپنی طرف مائل کرکے ان سے مادی ومعاشی فوائد حاصل کرکے اپنی خواہشات وچاہتوں کو پورا کرنا بھی تھا۔ یہ طرزِ عمل مخصوص گمراہ فرقوں کے علاوہ قصہ گو اور واعظ قسم کے لوگوں نے بھی اختیار کیا ہوا تھا، یہ لوگوں کو جھوٹی روایات، عجیب وغریب اور محیر العقول قسم کی باتیں گھڑ کر سنایا کرتے، تاکہ لوگ ان سے متأثر ہوکر ان کی مادی ومعاشی ضروریات کی تکمیل میں معاونت کریں۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ:

''ابراہیم بن فضل اصفہانی (متوفی: ۵۳۰ھ) اصفہان کے بازار میں کھڑے ہوکر اسی وقت اپنی طرف سے احادیث گھڑ کر لوگوں کو سنایا کرتا تھا اوران روایاتِ کاذبہ کے ساتھ صحیح روایات کی اسانید کو جوڑا کرتا تھا۔''(۱۲)

۷:......شخصی یا گروہی مفادات

جھوٹ وکذب میں منافست کا ایک سبب وہدف اپنے شخصی یا گروہی مفاد کے لیے بعض برگزیدہ اور بڑے لوگوں کی مدح یا مذمت میں احادیث وضع کرنا بھی تھا، جیسا کہ روافض کا یہ عمومی حال تھا، علامہ ذہبیؒ نے امام مازریؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ نعیم بن حماد امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مثالب میں جھوٹی روایات وضع کیا کرتا تھا۔(۱۳)

علامہ ذہبیؒ ہی نے لکھا ہے کہ: احمد بن عبداللہ جویباری نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مدح میں ایک حدیث وضع کی تھی۔(۱۴) ان تمام اسباب واہداف میں غور وفکر سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کذب ودروغ گوئی کے پھیلنے، پھلنے اور پھولنے کی اساس وبنیاد تو ان دروغ گوراویوں کے باطنی وداخلی امراض کے سبب وجود پذیر ہوئی، لیکن سیاسی، گروہی اور مادی ومعاشی عوامل نے اس کی گہرائی ونشاط میں اضافہ کرکے اسے مزید سہ آتشہ بنایا۔

دروغ گوئی کے تاریخِ اسلامی پر آثارِ سیئہ

دروغ گوراویوں کے اس مخصوص مکتبۂ فکر نے ہماری پوری تاریخِ اسلامی پر عام طور سے اور قرونِ ثلاثہ پر خاص طور سے بہت سے زہریلے اور برے اثرات چھوڑے۔ مقامِ دعوت وغور وفکر یہ ہے

کہ ان دروغ گو اور کذّاب (اور متہم بالکذب) لوگوں کی روایات ہماری تاریخ، ادب، عقائد اور دینی تصانیف میں سرایت کرگئیں، اور اُن کے ایک بڑے اور معتد بہ حصہ کو اپنے جھوٹ سے فاسد کرڈالا، جس کے نتیجہ میں وہ تصانیف ثقہ روایات کے ساتھ اَباطیل، خرافات و متناقضات کا مجموعہ بن کر رہ گئیں۔

تاریخِ طبری کا ایک سرسری جائزہ

جن حقائق کا ہم نے گزشتہ سطور میں تذکرہ کیا، ان کا ہماری اسلامی تاریخ سے کتنا تعلق ہے اور اس کے کیا برے اثرات مرتب ہوئے، ان کا ایک سرسری جائزہ لینے کی غرض سے ہم نے کتبِ تاریخ میں سے علامہ ابن جریر بن یزید طبری (متوفی: ۳۱۰ھ) کی مشہور و معروف تصنیف ’’تاریخ الأمم والملوک‘‘ ’’المعروف ’’تاریخ الطبری‘‘ کا بطور نمونہ کے انتخاب کیا ہے، تاریخِ طبری ہمارے عہدِ اسلامی کی تاریخ کا اہم مصدر ہونے کے علاوہ قرونِ ثلاثہ کے حوالہ سے سب سے اہم، کثیر المعلومات اور مستند کہی جانے والی کتاب ہے۔ اس لیے طبری اور ان کی کتاب کا مختصر سا تعارف کروانے کے بعد ہم اپنے اصل موضوع پر گفتگو کریں گے، تاکہ قاری پر یہ بات واضح ہو جائے کہ علامہ طبری خود تو ثقہ ہیں، لیکن ان کی کتاب رطب و یابس کا مجموعہ ہے۔

ابن جریر طبری کا مختصر تعارف

نام محمد، ولدیت جریر، دادا کا نام یزید اور کنیت ابوجعفر ہے، پیدائش طبرستان میں ہوئی تو اس کی نسبت سے طبری کہلاتے ہیں۔ سن ولادت میں دو قول ہیں: ۱:......۲۲۴ھ ہجری کے آخر میں۔ ۲:......۲۲۵ھ ہجری کے اول میں۔ ابن جریر خود اپنے ابتدائی حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ: میں نے سات سال کی عمر میں قرآن کریم حفظ یاد کرلیا۔ آٹھ سال کی عمر میں لوگوں کو نمازیں پڑھانا شروع کردیں اور نو سال کی عمر میں حدیث لکھنا شروع کردیا تھا۔ ابن جریر طبری نے علوم وفنون کی تکمیل کے لیے مختلف علماء اور علاقوں کی طرف اسفار کیے۔ عراق میں ابومقاتل سے فقہ پڑھی، احمد بن حماد دولابی سے کتاب المبتدا لکھی، مغازی محمد بن اسحاق کے واسطہ سے سلمہ بن فضل سے حاصل کیے اور اسی پر اپنی تاریخ کی بنیاد رکھی۔ کوفہ میں ہناد بن سری اور موسیٰ بن اسماعیل سے حدیث لکھی۔ سلیمان بن خلاد طلحی سے قراءت کا علم حاصل کیا۔ پھر وہاں سے بغداد لوٹ آئے، احمد بن یوسف تغلبی کی صحبت میں رہے اور اس کے بعد فقہ شافعی کی تحصیل کی طرف متوجہ ہوئے اور اسی کو اپنا مسلک ٹھہرا کر کئی سال تک اس کے مطابق فتویٰ دیتے رہے، بیروت میں عباس بن ولید بیروتی سے شامیوں کی روایت میں قراءات و تلاوت مکمل کی۔

مصر میں بھی ایک طویل دور تک قیام پذیر رہے، اسی اثنا میں شام چلے گئے، پھر لوٹ آئے اور امام مزنی اور عبدالحکم کے صاحبزادوں سے فقہ شافعی کا علم حاصل کیا اور ابن وہب کے

شاگردوں سے فقہ مالکی کی تحصیل کی۔ غرض علامہ طبری نے حدیث، تفسیر، قراءات، فقہ، تاریخ، شعر و شاعری اور تمام متداول علوم وفنون میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ مختلف عنوانات پر ۲۶/ کے قریب کتابیں تصنیف کیں، ان میں تفسیر طبری کے علاوہ تاریخِ طبری بہت زیادہ مشہور ومعروف ہے۔ (۱۵)

تاریخِ طبری کا مختصر تعارف

اس کتاب کا نام ''تاریخ الرسل والملوک '' یا ''تاریخ الأمم و الملوک '' ہے، البتہ تاریخ طبری کے نام سے عوام وخواص میں مشہور ہے۔ علامہ طبری کی یہ تصنیف عربی تصانیف میں مکمل اور جامع تصنیف شمار کی جاتی ہے۔ یہ کتاب ان سے پہلے کے مؤرخین: یعقوبی، بلاذری، واقدی، ابن سعد وغیرہ کے مقابلہ میں اکمل اور اُن کے بعد کے مؤرخین، مسعودی، ابن مسکویہ، ابن اثیر اور ابن خلدون وغیرہ کے لیے ایک رہنما تصنیف بنی۔ معجم الادباء میں یاقوت حموی نے لکھا ہے کہ: ابن جریر نے اپنی اس تالیف میں ۳۰۲ ہجری کے آخر تک کے واقعات کو بیان کیا اور بروز بدھ ۲۷/ربیع الاول ۳۰۳ ہجری میں اس کی تکمیل کی۔ (۱۶)

طرزِ نگارش

ابن جریر نے اپنی تاریخ کی ابتداء حدوثِ زمانہ کے ذکر، اولِ تخلیق یعنی قلم و دیگر مخلوقات کے تذکرہ سے کیا، پھر اس کے بعد آدم علیہ السلام اور دیگر انبیاء ورسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کے اخبار وحالات کو تورات میں انبیاء علیہم السلام کی مذکورہ ترتیب کے مطابق بیان کیا، یہاں تک کہ حضور اکرم ﷺ کی بعثت تک تمام اقوام اور ان کے واقعات کو بھی بیان کیا ہے۔ اسلامی تاریخ کے حوادث کو ہجرت کے سال سے لے کر ۳۰۲ ہجری تک مرتب کیا اور ہر سال کے مشہور واقعات وحوادث کو بیان کیا۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں حدیث، تفسیر، لغت، ادب، سیرت، مغازی، واقعات وشخصیات، اشعار، خطبات اور معاہدات وغیرہ کو خوبصورت اسلوب میں مناسب ترتیب کے ساتھ ہر روایت کو اس کے راوی اور قائل کی طرف (بغیر نقد وتحقیق کے) منسوب کیا اور اُسے کتاب اور فصول کے عنوان سے تقسیم کر کے ان کو علماء کے اقوال سے مزین کیا ہے۔

مصادرِ تصنیف

طبری نے اپنی اس تصنیف کے لیے جن مصادر کا انتخاب کیا، وہ یہ ہیں: ۱:...... تفسیر' مجاہد اور عکرمہ وغیرہ سے نقل کی۔ ۲:...... سیرت' ابان بن عثمان، عروہ بن زبیر، شرجیل بن سعد، موسیٰ بن عقبہ اور ابن اسحاق سے نقل کی۔ ۳:...... ارتداد اور فتوحاتِ بلاد کے واقعات' سیف بن عمر اسدی سے نقل کیے۔ ۴:...... جنگ جمل اور صفین کے واقعات' ابومخنف اور مدائنی سے نقل کیے۔ ۵:...... بنواُمیہ کی تاریخ' عوانہ بن حکم سے نقل کی۔ ۶:...... بنوعباس کے حالات' احمد بن ابوخیثمہ کی کتابوں سے لکھے۔

۷: ......اسلام سے قبل عربوں کے حالات' عبید بن شریۃ الجرہمی، محمد بن کعب قرظی اور وہب بن منبہ سے لیے۔ ۸: ......اہلِ فارس کے حالات' فارسی کتابوں کے عربی ترجموں سے لیے۔ ۹: ...... پوری کتاب میں مصنف کا اُسلوب یہ ہے کہ واقعات وحوادث اور روایات کو ان کی اسناد کے ساتھ بغیر کسی کلام کے ذکر کرتے چلے گئے ہیں۔ ۱۰: ......جن کتابوں اور مؤلفین سے استفادہ کیا ہے تو جگہ جگہ ان کے ناموں کی صراحت کی ہے۔ ۱۱: ......تاریخِ طبری کے بہت سارے تکملات لکھے گئے اور کئی لوگوں نے اس کا اختصار بھی کیا اور خود طبری نے سب سے پہلے اس کا ذیل لکھا۔ بعض حضرات نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا، پھر فارسی سے ترکی زبان میں بھی ترجمہ کیا گیا۔ (۱۷)

ابن جریر طبری کا مذہب

محترم قارئین کرام! تاریخِ طبری کے مصنف ''ابن جریر طبری'' کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ سنی شافعی المسلک تھے، طبقات شافعیہ اور دیگر رجال کی کتابوں میں یہی مذکور ہے، (۱۸) لیکن یہ یاد رہے کہ اسی نام وولدیت سے ایک اور شخص بھی گزرا ہے جو رافضی تھا، چناں چہ علمائے رجال نے وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ ابوجعفر محمد بن جریر بن رستم طبری رافضی تھا، اس کی بہت ساری تصانیف بھی ہیں، ان میں سے ایک ''کتاب الرواۃ عن أھل البیت '' بھی ہے، حافظ سلیمانیؒ کے کلام ''کان یضع للروافض '' کا مصداق بھی یہی شخص ہے۔ (۱۹)

علامہ ابن قیمؒ نے لکھا ہے کہ ابن جریر طبری (سنی) کے بارے میں (مسح رجلین کے قائل ہونے کا شبہ) اس لیے پیدا ہوا، کیوں کہ ابن جریر جو مسح رجلین کا قائل تھا وہ ان کے علاوہ ایک اور شخص ہے جو شیعی تھا، ان دونوں کا نام اور ولدیت ایک جیسی ہے، میں نے اس (ابن جریر شیعی) کی شیعہ مذہب کے اُصول وفروع کے بارے میں کتابیں دیکھیں ہیں۔ (۲۰)

حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا کہ: ابن جریر کے بارے مسح رجلین کے قائل ہونے کی جو حکایت بیان کی جاتی ہے تو اس سے مراد محمد بن جریر بن رستم رافضی ہے، کیوں کہ یہ ان کا مذہب ہے (نہ کہ اہل سنت کا)۔ (۲۱)

چوں کہ دونوں کا نام ولدیت اور کنیت ایک جیسی ہے، اس لیے بہت سارے خواص بھی اس سے دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ پہچان کا طریقہ یہ ہے کہ دونوں کے دادا کا نام جدا جدا ہے، سنی ابن جریر کے دادا کا نام یزید ہے اور رافضی ابن جریر کے دادا کا نام رستم ہے۔ (۲۲)

خود شیعہ مصنفین اور اصحابِ رجال میں سے بحرالعلوم طباطبائی، ابن الندیم، علی بن داوٗد حلّی، ابوجعفر طوسی، ابوالعباس نجاشی اور سیّد خوئی وغیرہ نے ابن جریر بن رستم طبری کے اہل تشیع میں سے ہونے کی تصریح کی ہے۔ (۲۳) بہرحال دونوں ناموں اور ولدیت وکنیت میں تشابہ ہے،

اسی تشابہ کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے شیعہ علماء نے ابن جریر شیعی کی بہت ساری کتابوں کی نسبت ابن جریر سنی کی طرف کرنے کی کوشش کی ہے، چناں چہ ڈاکٹر ناصر بن عبداللہ بن علی قفازی نے ''أصول مذهب الشيعة الإمامية الإثني عشرية عرض و نقد'' میں لکھا ہے:

''روافض نے اس تشابہ کو غنیمت جان کر ابن جریر سنی کی طرف بعض ان کتابوں کی نسبت کی ہے جس سے ان کے مذہب کی تائید ہوتی ہے، جیسا کہ ابن الندیم نے الفہرست، ص: ۳۳۵ میں ''كتاب المسترشد في الإمامة'' کی نسبت ابن جریر سنی کی طرف کی ہے حالاں کہ وہ ابن جریر شیعی کی ہے، دیکھیے: طبقات أعلام الشيعة في المائة الرابعة، ص: ۲۵۲، ابن شهر آشوب، معالم العلماء، ص: ۱۰۶، آج بھی روافض بعض ان اخبار کی نسبت امام طبری کی طرف کرتے ہیں جن سے ان کے مذہب کی تائید ہوتی ہے، حالاں کہ وہ اس سے بری ہیں، دیکھیے: الأميني النجفي، الغدير: ۱/۲۱۴-۲۱۶۔ روافض کے اس طرزِ عمل نے ابن جریر طبری سنی کو ان کی زندگی میں بہت سارے مصائب سے دوچار کیا، یہاں تک کہ عوام میں سے بعض لوگوں نے اُنہیں رفض سے متّہم بھی کیا، جیسا کہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے، دیکھیے: البداية و النهاية: ۱۱/۱۴۶۔''(۲۴)

موضوعِ بحث

اس وقت ہمارا موضوعِ بحث علامہ ابن جریر بن یزید طبری شافعیؒ اور ان کی تاریخ ہے، کیونکہ موصوف بڑے اور بلند مرتبہ کے عالم سمجھے جاتے ہیں، خاص کر قرونِ ثلاثہ کی تاریخ کے حوالہ سے ان کا نام اور کتاب کسی تعارف کی محتاج نہیں، قدیم وجدید تمام مؤرخین نے ان سے استفادہ کیا ہے۔

تاریخِ طبری کا اجمالی جائزہ

ان ساری خصوصیات کے باوجود تاریخِ طبری میں جگہ جگہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے متعلق ایسی بے بنیاد اور جھوٹی روایات مروی ہیں، جن کی کوئی معقول ومناسب توجیہ نہیں کی جاسکتی ہے، جب کہ عدالتِ صحابہ کرامؓ پر موجود قطعی نصوصِ قرآن وسنت اور اجماعِ امت کے پیشِ نظر منصف مزاج اہلِ علم امام طبری اور خاص کر ان کی تاریخ میں مروی اس طرح کی روایات پر کلام کرنے پہ مجبور ہوئے ہیں، چوں کی تاریخِ طبری بڑے بڑے دروغ گو، کذّاب اور متہم بالکذب راویوں کی روایات سے بھری ہوئی ہے، بطورِ مثال کے تاریخِ طبری کی روایات کا ایک جائزہ لینے کے لیے ڈاکٹر خالد علال کبیر صاحب نے تاریخِ طبری میں موجود ثقہ وغیر ثقہ راویوں کی روایات کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا ہے، چناں چہ وہ لکھتے ہیں کہ: تاریخِ طبری میں اس کے بارہ (۱۲) مرکزی رواۃ کی روایات کا جائزہ لیتے ہیں، جن میں سے سات راوی کذّاب یا متہم بالکذب ہیں اور پانچ ثقہ ہیں:

دروغ گو اور متہم بالکذب راویوں کی روایات کا اجمالی خاکہ

محمد بن سائب کلبی کی بارہ (۱۲) روایات، ہشام بن محمد کلبی کی پچپن (۵۵) روایات، محمد بن عمر کی چار سو چالیس (۴۴۰) روایات، سیف بن عمر تمیمی کی سات سو (۷۰۰) روایات، ابومخنف لوط بن یحییٰ کی چھ سو بارہ (۶۱۲) روایات، ہیثم بن عدی کی سولہ (۱۶) روایات، محمد بن اسحاق بن یسار[۲۵] کی ایک سو چونسٹھ (۱۶۴) روایات ہیں، ان سب کی روایات کا مجموعہ جن کو مؤرخ طبری نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے وہ انیس سو ننانوے (۱۹۹۹) ہے۔

ثقہ راویوں کی روایات کا اجمالی خاکہ

زبیر بن بکار کی آٹھ (۸) روایات، محمد بن سعد کی ایک سو چونسٹھ (۱۶۴) روایات، موسی بن عقبہ کی سات (۷) روایات، خلیفہ بن خیاط کی ایک (۱) روایت، وھب بن منبہ کی چھیالیس (۴۶) روایات ہیں۔ تاریخِ طبری کے ان پانچ ثقہ راویوں کی روایات کا مجموعہ دو سو چھبیس (۲۲۶) ہے۔

تو گویا تاریخ طبری میں دو سو چھبیس (۲۲۶) ثقہ روایات کے مقابلہ میں ان سات دروغ گو اور متہم بالکذب راویوں کی انیس سو ننانوے (۱۹۹۹) روایات ہیں، ان دونوں کے تناسب سے اندازہ لگا جا سکتا ہے کہ تاریخ طبری جیسی قدیم اور مستند سمجھی جانے والی کتاب کا جب یہ حال ہے تو تاریخ کی باقی کتابوں کا کیا حال ہوگا۔[۲۶]

علامہ طبری کا اعتراف

مذکورہ بالا باتوں کی تائید خود علامہ طبری کے اپنی تاریخ کے مقدمہ میں اس اعتراف سے بھی ہوتی ہے جس میں انہوں نے واضح طور سے کہا ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب میں بغیر نقد وتمحیص کے مختلف فرقوں اور گروہوں کے راویوں کی روایات کو ان کی اسانید کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ چناں چہ قارئین کے اطمینانِ قلبی کی خاطر علامہ طبری کی وہ پوری عربی عبارت پیشِ خدمت ہے، جس میں انہوں نے محض سند کے ساتھ بغیر نقد وتمحیص کے روایات ذکر کرنے کا اعتراف کیا ہے:

" فما يكن في كتابي هذا من خبر ذكرناه عن بعض الماضين مما يستنكرهُ قارئُهُ، أو يستشنعهُ سامعهُ من أجل أنهُ لم يعرف لهُ وجهًا في الصحة، ولا معنى في الحقيقة، فليعلم أنهُ لم يؤت في ذٰلک من قبلنا، و إنما من قبل بعض ناقليه إلينا، وإنا إنما أدينا ذٰلک على نحو ما أدى إلينا ۔"[۲۷]

محترم قارئین کرام! کیا صرف سند کے ساتھ رطب و یابس، غث وسمین اور ثقہ وغیر معتبر ہر طرح کی روایات کا نقل محض کسی بھی ثقہ مصنف کے لیے معقول عذر بن سکتا ہے؟ اس پر اپنی ذاتی

رائے اور نقطہ نظر پیش کرنے کی بجائے ہم محقق علماء کی آرا نقل کر کے فیصلہ انصاف پسند قارئین پر چھوڑتے ہیں۔

علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا اعتراف

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ابن جریر طبری ائمہ جرح وتعدیل کے نزدیک ثقہ ہیں، لیکن ان کے بارے میں تشیع کی طرف میلان کا قول بھی مروی ہے، چناں چہ علامہ ذہبیؒ اور حافظ ابن حجرؒ نے ان کی توثیق کرنے کے ساتھ ساتھ دبے لفظوں میں ان کے تشیع کی طرف میلان کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے: ''ثقة صادق فيه تشيع يسير و موالاة لاتضر۔''(۲۸) شاید ان دونوں حضرات کے کلام کا مقصد یہ ہو کہ چوں کہ علامہ طبری نے اپنی تاریخ میں ایسی روایات بغیر نقد وکلام کے نقل کی ہیں جن سے ان کا تشیع کی طرف میلان معلوم ہوتا ہے، لہٰذا اس تصریح کے بعد طبری کی وہ تمام روایات جن سے اہل تشیع کے مخصوص افکار کی تائید ہوتی ہے، وہ غیر معتبر قرار پائیں گی۔

محققِ عصر مولانا محمد نافع رحمۃ اللہ علیہ کا تبصرہ

تاریخِ طبری میں منقول معتضد باللہ عباسی کا رسالہ جسے مؤرخ طبری نے ۲۸۴ھ کے تحت بلاکسی نقد وتحقیق وتمحیص اور کلام کے نقل کیا ہے، جس میں حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ دونوں حضرات کے خلاف سب وشتم اور لعن طعن کرنے کے جواز میں مواد فراہم کیا اور اس میں موجباتِ لعن وطعن درج کیے ہیں، اس رسالہ پر تنقید کرتے ہوئے ''الطبری کی حکمت عملی'' کے تحت محققِ عصر، یگانۂ روزگار اور عبقری شخصیت حضرت مولانا محمد نافع رحمۃ اللہ علیہ، فاضل دارالعلوم دیوبند نے ''فوائدِ نافعہ'' میں جو کچھ فرمایا، وہ من وعن پیشِ خدمت ہے:

> ''غور طلب بات یہ ہے کہ صاحب التاریخ محمد ابن جریر الطبری کے لیے عباسیوں کے اس فراہم کردہ غلیظ مواد کو من وعن نقل کر کے اپنی تصنیف میں شامل کرنے کا کون سا داعیہ تھا؟ اور اس نے کون سی مجبوری کی بنا پر یہ کارِ خیر پورا کیا؟ گویا الطبری نے اس مواد کو اپنی تاریخ میں درج کر کے آنے والے لوگوں کو اس پر آگاہ کیا اور سب وشتم اور لعن طعن کے جو دلائل عباسیوں نے مرتب کروائے تھے، ان پر آئندہ نسلوں کو مطلع کرنے کا ثواب کمایا؟ چناں چہ شیعہ اور روافض رسالہ مذکورہ میں مندرجہ مواد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنی کتب میں حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر مطاعن قائم کرتے ہیں اور شدید اعتراضات پیدا کرتے ہیں۔ درحقیقت الطبری نے اہلِ اسلام میں انتشار پھیلانے اور افتراق ڈالنے کے لیے بڑی عجیب تدبیر اور حکمت عملی اختیار کی، جس سے مخالفین صحابہؓ کو یک گونہ رہنمائی حاصل ہوئی اور ان کو عداوت پوری کرنے کے لیے ایک تیار شدہ مواد دستیاب ہوگیا۔ کئی

لوگ ان دلائل پر نظر کرنے میں متذبذب ہوں گے، کئی ناظرین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے متنفر ہوں گے اور بعض قارئین دل برداشتہ ہوکر اموی صحابہ رضی اللہ عنہم سے منحرف ہو جائیں گے۔ الطبری کو اس باطل مواد کو اس تفصیل کے ساتھ ذکر ہی نہیں کرنا چاہیے تھا، بلکہ صرف ایک واقعہ تاریخ کی حیثیت سے اجمالاً ذکر کردینا کافی تھا، جیسا کہ باقی مؤرخین نے واقعہ ہذا کو اجمالاً درج کیا ہے اور دلائل کی تفصیل کی طرف نہیں گئے اور اگر کسی مجبوری کی وجہ سے ذکر کیا تھا تو اس مواد کے بطلان پر کچھ تو کلام کرنا چاہیے تھا، تاکہ لوگ اس سے غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں، لیکن الطبری نے ایسا نہیں کیا۔ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب التاریخ طبری کی نیت بخیر نہ تھی، بلکہ فاسد تھی، اور ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حق میں الطبری خود سوءِ ظنی کا مریض تھا۔(لکل امرئ مانوی. جزاہ اللّٰہ تعالٰی علی حسب مرامہ)۔''(۲۹)

مولانا مہر محمد میانوالوی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے

''ابن جریر طبری کا مذہب'' اس عنوان کے تحت مولانا مہر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ:

''یہ وہی امام طبری المتوفی ۳۱۰ھ ہیں جنہیں اہل بغداد نے تشیع سے متہم کرکے اپنے قبرستان میں دفن نہ ہونے دیا تھا(۳۰)، گو شیعہ نہیں ہیں، تاہم اپنی تاریخ یا تفسیر میں ایسی کچی پکی روایات خوب نقل کردیتے ہیں جو شیعہ کی موضوع یا مشہور کی ہوئی ہوتی ہیں۔''(۳۱)

عرب علماء کی رائے

معاصر عرب اہل علم حضرات میں سے ڈاکٹر خالد علال کبیر صاحب (۳۲) نے اپنی کتاب ''مدرسة الكذابين في رواية التاريخ الإسلامي و تدوينه'' میں مؤرخ طبری کے اس مخصوص طرزِ عمل کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''میرے نزدیک انہوں نے یہ (یعنی تحقیق وتمحیص کے بغیر صرف اسانید کے ساتھ روایات کو نقل کرکے) ایک ناقص کام کیا ہے، اور ان تمام روایات کے وہ خود ذمہ دار ہیں جو انہوں نے اپنی تاریخ میں مدون کی ہیں، پس انہوں نے عمداً دروغ گو راویوں سے بکثرت روایات نقل کیں اور ان پر سکوت اختیار کیا، یہ انتہائی خطرناک معاملہ ہے جو بعد میں آنے والی بہت ساری نسلوں کی گمراہی کا سبب بنا، اُنہیں (طبری) کو چاہیے تھا کہ وہ ان دروغ گو راویوں کا بغیر ضرورت کے تذکرہ نہ کرتے، یا ان پر نقد کرتے اور ان کی روایات کی جانچ پڑتال کرتے، صرف ان کی اسانید کے ذکر پر اکتفا کرکے سکوت اختیار نہ کرتے۔ نقدِ روایات اس لیے ضروری تھا، کیوں کہ تاریخِ طبری کا مطالعہ کرنے والوں میں غالب اکثریت ان لوگوں کی ہے جن میں اتنی علمی صلاحیت نہیں

ہوتی کہ وہ ان روایات پر سند ومتن کے اعتبار سے نقد کرسکیں، چہ جائے کہ اگر اس سے استفادہ کرنے والے صرف حدیث، تاریخ ودیگر علوم میں متبحر ہوتے تو تب یہ طے شدہ بات تھی کہ وہ نقد وتمحیص کا عمل انجام دیتے۔‘‘(۳۳)

ڈاکٹر صاحب موصوف مزید لکھتے ہیں کہ:

’’اس معاملہ کو اس سے بھی زیادہ سنگین اس بات نے کردیا کہ طبری کے بعد آنے والے اکثر مؤرخین نے قرونِ ثلاثہ کے بارے میں ان سے بکثرت روایات نقل کی ہیں، جیسا کہ ابن جوزی نے اپنی کتاب ’’**المنتظم**‘‘ میں، ابن الاثیر نے ’’**الکامل**‘‘ میں اور ابن کثیر نے ’’**البدایة**‘‘ میں بغیر سند کے نقل کیا ہے، اور ان حضرات کا اس طرح بغیر سند کے روایات نقل کرنے سے ثقہ اور دروغ گو راویوں کی روایات خلط ملط ہوگئیں ہیں، بسا اوقات تاریخ طبری کی طرف مراجعت کے بغیر ان روایات میں تمیز مستحیل ہوجاتی ہے۔‘‘(۳۴)

محترم قارئین! یہ تو صرف تاریخِ طبری سے متعلق ایک سرسری جائزہ ہے، ورنہ ہر روایت پر سند اور متن کے اعتبار سے تفصیلی کلام کے لیے مستقل دفتر کی ضرورت ہے، ممکن ہے کہ کسی کو اس جائزہ سے اختلاف ہو یا وہ اُسے مبالغہ پر محمول کرے، یا حقیقت سے بعید قرار دے، لیکن یاد رہے اس طرح کی باتیں کرنے والا یا تو تاریخ اور اس کی تدوین اور پسِ منظر اور اس میں دروغ گوئی کے اسباب واہداف سے ناواقف ہوگا، یا واقفیت کے باوجود انکار کررہا ہوگا تو اُسے تجاہلِ عارفانہ کی بجائے تجاہلِ جاہلانہ وعنادیہ میں سے قرار دینا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہاں تو صرف ایک کتاب کے بارے میں ایک سرسری سا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اگر کوئی صاحبِ علم وتجربہ اور درستگیِ فکر کا حامل مؤرخ تاریخ، تراجم، فِرَق اور مختلف مذاہب سے متعلق کتابوں کا نقد وتحقیق کے اصولوں کی روشنی میں ایک معتدلانہ جائزہ لے گا تو وہ اس سے بھی زیادہ عجیب وغریب، باہم متناقض اور مستحیل قسم کی روایات کو پائے گا، جنہیں قرونِ ثلاثہ میں اُمتِ مسلمہ کے سیاسی، گروہی اور مختلف فرقوں کی تقسیم کے نتیجہ میں دروغ گو راویوں کا لازمی نتیجہ ہائے فکر قرار دیئے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں پائے گا۔

افتراق وانتشار اور گروہی اختلافات کی اَساس

غرض کذّاب اور دروغ گو راویوں کی موضوع ومن گھڑت اور نصوصِ شریعت وحاملینِ دینِ متین سے متصادم روایات ہی اُمتِ مسلمہ میں افتراق وانتشار اور تمام گروہی اختلافات کی اَساس وبنیاد ہیں، جن کو صراطِ مستقیم سے منحرف فرقوں نے جب مذہبی قداست کا لبادہ اوڑھا دیا تو اس مکتبۂ فکر کے ماننے والوں نے ان روایات کو دین اور رجال پر طعن کرنے، گمراہ افکار کی نصرت وتائید، مسلمہ حقائق اور متوارث تاریخِ اسلامی میں تشکیک پیدا کرنے کے لیے بطور سلاح کے استعمال کرنا شروع کردیا۔

اتحادِ اُمت کا نسخہ کیمیا

اُمتِ مسلمہ کا درد رکھنے والا منصف مزاج محقق ضرور اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ ان دروغ گو مکتبہ فکر کے گمراہ لوگوں نے اپنے مخصوص افکار وعقائد کی بنیاد اپنے مکتبۂ فکر کے ان مخصوص اور دروغ گوراویوں کی روایات پر رکھی ہے، اور قرآن کریم اور سنتِ صحیحہ و دیگر نصوصِ شریعت کو درخورِ اعتناء نہیں سمجھا۔ اگر یہ گمراہ فرقے آج بھی قرآن کریم، سنتِ صحیحہ اور دیگر متواتر وقطعی نصوصِ شریعت کی طرف رجوع کریں گے تو اُمتِ مسلمہ میں ہر طرح کے اختلاف ختم ہو جائیں اور یہ اُمت پھر سے ایک جسد وقلب کی مانند متفق ومتحد ہو جائے گی، اُمتِ مسلمہ کی اتحاد کا یہی ایک نسخۂ کیمیا ہے۔

تدوینِ جدید کی ضرورت

موجودہ حالات میں اُمتِ مسلمہ کے اختلافات، انتشار اور فرقوں میں تقسیم کو دیکھتے ہوئے ایک معتدل اور اُمت کا درد رکھنے والا مؤرخ ضرور تاریخ اسلامی کی تدوینِ جدید کی آواز اٹھائے گا۔ تدوینِ جدید کے لیے کیا جانے والا جدید مطالعہ درج ذیل نکات کی روشنی میں ہوتو زیادہ مفید مؤثر اور نتیجہ خیز ثابت ہوسکتا ہے:

ا:......شریعتِ مطہرہ اور درایت وعقل کے خلاف روایت مردود ہے، چناں چہ علماء نے صراحت کی ہے کہ جو روایت بھی درایت اور عقل کے خلاف ہو، یا اُصولِ شریعت کے مناقض ہو تو جان لیں کہ وہ روایت موضوع ہے اور اس کے راویوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ اسی طرح جو روایت حس اور مشاہدہ کے خلاف ہو، یا قرآن کریم، سنتِ متواترہ اور اِجماعِ قطعی کے مبائن ہو تو وہ روایت بھی قابلِ قبول نہیں۔ (۳۵)

۲:...... صحابہؓ وائمہ دین کی عیب جوئی سے متعلق روایت بھی قابلِ اعتبار نہیں، کیوں کہ روایات وضع کرنے والوں میں بعض لوگ وہ ہیں جنہوں نے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ائمہ دین کی برائیاں اور عیب بیان کرنے کے لیے، یا اپنے دیگر مذموم اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے روایات وضع کی ہیں۔ ان کا یہ عمل یا تعنت وعناد کی وجہ سے ہے یا تعصب وفساد کی وجہ سے ہے، پس ان لوگوں کی روایات کا کوئی اعتبار نہیں، جب تک کہ ان کی کوئی سند معتمد نہ پائی جائے، یا سلف صالحین میں سے کسی نے اس پر اعتماد نہ کیا ہو۔ (۳۶)

علامہ نوویؒ نے قاضی عیاضؒ اور علامہ مازریؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:

’’ہمیں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ حسنِ ظن رکھنے اور ہر بری خصلت کی ان سے نفی کا حکم دیا گیا ہے، لہٰذا اگر اُن کے بارے میں کسی روایت میں اعتراض پایا جائے اور اس کی صحیح تاویل کی کوئی گنجائش نہ ہو تو اس صورت میں ہم اس روایت کے راویوں کی

طرف جھوٹ کی نسبت کریں گے۔‘‘ (۳۷)

علامہ عبدالعزیز پرہاڑوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ:

’’اس بارے میں اہلِ سنت کا مذہب یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اس کی مناسب تاویل کی جائے اور اگر مناسب تاویل ممکن نہ ہو تو اس روایت کو رَد کر کے سکوت اختیار کرنا واجب ہے اور طعن کو بالیقین ترک کرنا ہوگا، اس لیے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مغفرت اور جنت کا وعدہ کیا ہے۔‘‘ (۳۸)

۳:...... نہایت اعتدال کے ساتھ ان تمام مؤرخین کی کتابوں سے ثقہ اور جھوٹے وکذّاب راویوں کی روایات میں تمیز کی جائے، جنہوں نے اپنی کتابوں میں دونوں طرح کی روایات کو جگہ دی ہے، جیسا کہ خلیفہ بن خیاط، محمد بن سعد، زبیر بن بکار، موسیٰ بن عقبہ، وہب بن منبہ، ابن جریر طبری اور ابن اثیر وغیرہ۔

۴:...... تاریخی روایات کی سند اور متن ہر دو اعتبار سے نقد وتمحیص وتحقیق کے مسلمہ قواعد کی روشنی میں جائزہ لے کر ان پر محتاط ومحققانہ کلام کیا جائے۔

۵:...... اس بات میں بھی تفریق ضروری ہے کہ مؤلف اور صاحبِ تاریخ خود تو ثقہ ہیں، لیکن اس نے نقلِ واقعات وروایات میں دروغ گو اور کذّاب راویوں پر اعتماد کیا ہے، جیسا کہ ابن جریر طبری کا حال ہے، ایسی صورت میں اس مؤرخ کی صرف ثقہ راویوں والی روایات مقبول قرار پائیں گی، دروغ گو وکذّاب رواۃ کی روایات مردود سمجھی جائیں گی۔ (۳۹)

۶:...... اگر صاحبِ تاریخ خود کذّاب ودروغ گو ہو تو پھر اس کی کتاب میں موجود ثقہ لوگوں کی روایات بھی غیر معتبر قرار دے دی جائیں گی۔

۷:...... اصل اور ضابطہ تو کذاب راویوں کی روایات کے بارے میں عدمِ قبولیت کا ہے، البتہ اگر ان کی کوئی روایت، قرآن کریم، سنتِ مبارکہ اور اجماعِ اُمت کے مخالف نہ ہو تو دیگر ثقہ راویوں کی روایت کی تائید میں قرائن ومرجحات کی موجودگی میں قبول کرنے کی گنجائش ہوگی۔

۸:...... دینی اُمور، صحابہ کرامؓ، ائمہ وسلف صالحین کے علاوہ دیگر دنیاوی معاملات میں اگر کسی ثقہ راوی کی روایت دستیاب نہ ہو تو بصورتِ مجبوری دروغ گو راویوں سے منقول روایات نقلِ واقعہ کی غرض سے ذکر کرنے کی گنجائش ہوگی، مگر اس سے علم یقین حاصل نہ ہوگا۔

۹:...... تاریخ اور تحقیق کے نام پر محض مؤرخین کی ذکر کردہ روایات سے اخذ کردہ نتائج بھی غیر مقبول شمار ہوں گے، البتہ حقیقی اور مسلمہ اُصولوں کے تحت روایت قابل قبول قرار پائے تو اس سے ماخوذ نتائج درست قرار دیئے جائیں گے۔

۱۰: ......اس پورے عمل کے دوران اس بات کا استحضار رہے کہ ہماری تاریخ دروغ گو مکتبہ فکر کے اغواکاری کا شکار رہی ہے، لہٰذا معمولی غفلت سے بھی موجودہ اور آئندہ آنے والی اُمتِ مسلمہ کی نسلوں میں تشکیک، تحریف، تضلیل، ائمہ دین واسلاف سے بیزاری اور گروہی اختلافات کی آڑ میں ان تاریخی روایات کی بنیاد پر کشت وخون کی ہولیاں کھیلی جائیں گی۔ (۴۰)

أللّٰهم أرنا الحقّ حقًّا وارزقنا اتباعهٗ و أرنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابهٗ

حواشی وحوالہ جات

۱: ......القاموس المحیط للفیروزآبادی، فصل الھمزۃ، ج:۱،ص:۳۱۷۔ المحکم والمحیط الاعظم لابن سیدۃ، فصل الخاء واللام والھمزہ، ج:۵، ص:۲۳۸، دارالکتب العلمیہ، بیروت۔ المعجم الوسیط، باب الھمزہ، ج:۱،ص:۱۳، دارالنشر۔ تاج العروس، أرخ، ج:۷،ص:۲۲۵، دار الھدایہ۔ لسان العرب، أرخ، ج:۳،ص:۴، دارصادر۔

۲: ......الصحاح، ج:۱،ص:۴۴۰، مختار الصحاح، باب الألف، ج:۱،ص:۱۳، مکتبۃ لبنان ناشرون۔

۳: ......القاموس المحیط للفیروزآبادی، فصل الھمزۃ، ج:۱،ص:۳۱۸۔ المحکم والمحیط، ج:۵،ص:۲۳۸۔ المغرب، الھمزہ مع الراء، ج:۱،ص:۳۵، مکتبۃ اسامۃ بن زید حلب۔ لسان العرب، ج:۳،ص:۴۔ الصحاح، ج:۱،ص:۴۴۰۔

۴: ......تفصیل کے لیے دیکھئے: الشماریخ فی علم التاریخ للسیوطی، ج:۱،ص:۱۰-۱۴، الدار السلفیۃ کویت۔ تاریخ ابن خلدون، ج:۱،ص:۳، ۹، ۳۵۔ تاریخ الإسلام للذہبی، ج:۱،ص:۱۲، دارالکتاب العربی۔ تاریخ الطبری، ج:۱،ص:۱۲، دارالکتب العلمیہ۔

۵: ......الکامل فی التاریخ، ج:۱،ص:۹، دارالکتب العلمیہ۔ الشماریخ فی علم التاریخ للسیوطی، ج:۱،ص:۱۴۔

۶: ......تفصیل کے لیے دیکھیے: تاریخ اسلام، مولانا اکبرشاہ نجیب آبادی، ج:۱،ص:۲۳، ۲۴، مکتبۃ العلم کراچی۔

۷: ......طبقات الشافعیۃ، ج:۱،ص:۱۹۷، ۱۹۸، دارالمعرفۃ، بیروت۔

۸: ......بحوالہ سیرت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، ج:۲،ص:۱۲، دارالکتاب، لاہور۔

۹: ......میزان الاعتدال، ج:۱،ص:۲۴۵، دارالکتب العلمیہ۔

۱۰: ......تفصیل کے لیے دیکھیے: الضعفاء لابن الجوزی، ج:۳،ص:۸۴، ج:۴،ص:۳۶۵، دارالکتب العلمیہ۔

۱۱: ......میزان الاعتدال، ج:۲،ص:۱۷۱۔

۱۲: ......لسان المیزان، ج:۱،ص:۱۳، مؤسسۃ العلمی، بیروت۔

۱۳: ......میزان الاعتدال، ج:۷،ص:۴۴۔

۱۴: ......میزان الاعتدال، ج:۲۴۵۱۔

۱۵: ......طبقات الشافعیۃ الکبریٰ للسبکی، ج:۲،ص:۱۳۸.۱۳۵۔ تذکرۃ الحفاظ، ج:۲،ص:۱۶.۱۷.۲۱۷، دار الصمیعی۔ میزان الاعتدال، ج:۳،ص:۴۹۸، ۴۹۹۔ لسان المیزان، ج:۵،ص:۱۰۰، ۱۰۳۔ وفیات الأعیان لابن خلکان، ج:۴،ص:۱۹۱، دار صادر۔ الأعلام للزرکلی، ج:۶،ص:۶۹، دارالعلم للملایین۔

۱۶: ......معجم الأدباء، ج:۶،ص:۵۱۶، مؤسسۃ المعارف۔

۱۷: ......مقدمۃ ملحقۃ فی بدایۃ تاریخ الطبری،ص۷، ۸، دارالکتب العلمیہ۔

۱۸: ......طبقات الشافعیۃ الکبریٰ، ج:۲،ص:۱۳۵-۱۳۸۔ تذکرۃ الحفاظ، ج:۲،ص:۲۱۰-۲۱۷۔ میزان الاعتدال، ج:۳،ص:

۴۹۸، ۴۹۹۔لسان المیزان، ج:۵،ص:۱۰۰-۱۰۳۔

۱۹:......تذکرۃ الحفاظ، ج:۲،ص:۱۰۷-۱۶۷۔میزان الاعتدال، ج:۳،ص:۴۹۸، ۴۹۹۔لسان المیزان، ج:۵،ص:۱۰۰-۱۰۳۔

۲۰:......حاشیۃ الإمام ابن القیم علی سنن ابی داؤد فی ذیل عون المعبود، ج:۲،ص:۲۰۵۔

۲۱:......لسان المیزان، ج:۵،ص:۱۰۳۔

۲۲:......میزان الاعتدال، ج:۳،ص:۴۹۹۔لسان المیزان، ج:۵،ص:۱۰۳۔

۲۳:......الفوائد الرجالیۃ، ج:۷، ص:۱۹۹،مکتبۃ العلمین الطّوسی و بحر العلوم فی نجف الاشرف، مکتبۃ الصادق طہران۔ الفہرست،ص:۵۸۔رجال ابن داؤد للحلّی، ج:۱،ص:۳۸۶۔رجال الطّوسی لابی جعفر الطّوسی، ج:۲،ص:۲۴۲،مؤسسۃ النشر الإسلامی قم۔رجال النجاشی لأبی العباس أحمد بن علی النجاشی، ج:۱،ص:۳۷۸،مؤسسۃ النشر الإسلامی قم۔معجم رجال الحدیث للسید الخوئی، ج:۱، ص:۱۳۲، ج:۱۲،ص:۱۵۴،ایران۔

۲۴:......اصول مذہب الشیعۃ الإمامیۃ الإثنی عشریۃ،عرض ونقد، ج:۳،ص:۱۴۹۔

۲۵:......ڈاکٹر خالد صاحب کی کتاب میں دوبار ''یبار'' کی جگہ ''سیار'' آیا ہے، غالبًا یہ کمپوزنگ کی غلطی ہے، محمد بن اسحاق بن یسار کے بارے میں جرح اور تعدیل دونوں طرح کے اقوال ملتے ہیں، البتہ ابن اسحاق جمہور کے نزدیک ثقہ ہے۔(تعلیقات الشیخ عبدالفتاح أبوغدہ علی الرفع والتکمیل،ص:۱۱۴۔۱۱۶،مکتبۃ الدعوۃ الإسلامیۃ بشاور) لیکن یہ ذہن نشین رہے کہ موصوف چوں کہ تشیع سے بھی متہم ہے۔(تہذیب الکمال، ج:۲۴،ص:۴۱۶،مؤسسۃ الرسالۃ) اس لیے ان کی وہ تمام روایات جن سے تشیع کی کسی بھی طرح تائید ہوتی ہے غیر معتبر ہوں گی۔

۲۶:......تفصیل کے لیے دیکھیے: مدرسۃ الکذابین فی روایۃ التاریخ الإسلامی وتدوینہ،ص:۴۵۔۴۷، دارالبلاغ، الجزائر۔

۲۷:......تاریخ الطبری، خطبۃ الکتاب، ج:۱،ص:۱۳۔

۲۸:......میزان الاعتدال، ج:۳،ص:۴۹۹،لسان المیزان، ج:۵،ص:۱۰۰۔

۲۹:......فوائد نافعہ، ج:۱،ص:۵۷۔۵۸، دارالکتاب لاہور۔

۳۰:......معجم الأدباء، ج:۶،ص:۵۱۴۔

۳۱:......ہزار سوال کا جواب،ص:۹۷،مرحبا اکیڈمی۔

۳۲:......موصوف نے جامعۃ الجزائر سے تاریخ اسلامی میں ڈاکٹریٹ کی ہوئی ہے۔

۳۳:......مدرسۃ الکذابین فی روایۃ التاریخ الإسلامی وتدوینہ، ج:۱،ص:۶۷، ۶۸۔

۳۴:......حوالہ سابقہ۔

۳۵:......فتح المغیث، ج:۱،ص:۲۴۹، ۲۵۰۔

۳۶:......الاجوبۃ الفاضلۃ للأسئلۃ العشرۃ الکاملۃ،ص:۲۹۔

۳۷:......شرح النووی، کتاب الجہاد، باب حکم الفیء، ج:۱۲،ص:۲۹۶، دارالمعرفۃ، بیروت۔

۳۸:......الناہیۃ عن طعن أمیر المؤمنین معاویۃ رضی اللہ عنہ،ص، ج:۲۶۔

۳۹:......مدرسۃ الکذابین فی روایۃ التاریخ الإسلامی وتدوینہ،ص:۵۳۔

۴۰:......حوالہ سابقہ

’’شَرَائِعُ مَنْ قَبْلَنَا‘‘ اور اُن کا حکم

مولانا انعام اللہ
فاضلِ جامعہ و چیف ریسرچ آفیسر اسلامی نظریاتی کونسل

(پانچویں قسط)

پہلے مسلک کی تائید میں پیش کردہ استدلالات کے جوابات

پہلی آیتِ کریمہ سے استدلال کا جواب

امام غزالیؒ رقم طراز ہیں:

’’أُولٰئِکَ الَّذِیْنَ ھَدٰی اللّٰہُ فَبِھُدَاھُمُ اقْتَدِہْ‘‘ (الأنعام:۹۰) قلنا أراد بالھدی التوحید، ودلالۃ الأدلۃ العقلیۃ علی وحدانیتہٖ وصفاتہٖ بدلیلین: أحدھما: أنہٗ قال: ’’فَبِھُدَاھُمُ اقْتَدِہْ‘‘ (الأنعام:۹۰) ولم یقل بھم، وإنما ھداھم الأدلۃ التی لیست منسوبۃ إلیھم، أما الشرع فمنسوب إلیھم فیکون اتباعھم فیہ اقتداء بھم. الثانی: أنہٗ کیف أمر بجمیع شرائعھم وھی مختلفۃ وناسخۃ ومنسوخۃ ومتی بحث عن جمیع ذٰلک، وشرائعھم کثیرۃ، فدل علی أنہٗ أراد الھدی المشترک بین جمیعھم وھو التوحید۔‘‘(۱)

’’أُولٰئِکَ الَّذِیْنَ ‘‘ والی آیتِ کریمہ میں ’’ھدی‘‘ سے توحید اور اللہ کی وحدانیت اور صفات پر دلائلِ عقلیہ کی دلالت مراد ہے۔ اس بات کی دو دلیلیں ہیں: پہلی دلیل یہ کہ: ’’فَبِھُدَاھُمُ اقْتَدِہْ ‘‘ (یعنی ان کی ہدایت کی اقتداء) فرمایا، ’’بِھِمْ‘‘ (ان کی اقتداء) نہیں فرمایا اور انبیاء کرام علیہم السلام کی ہدایت سے مراد دلائل ہیں، جو اُن کی طرف منسوب نہیں، جبکہ شریعت ان کی طرف منسوب ہے، پس شریعت میں پیروی ان انبیاء علیہم السلام کی اقتداء ہوگی، (ان کی ’’ھُدٰی‘‘ کی پیروی نہیں ہوگی)۔ دوسری دلیل یہ کہ: تمام شرائع کی اقتداء کا حکم دینا کیونکر ممکن ہے، جبکہ وہ شرائع باہم مختلف ہیں، ان میں ناسخ ومنسوخ پائے جاتے ہیں، اور کب آپ نے ان تمام شرائع کو تلاش کیا، جبکہ شریعتیں لاتعداد ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل

ہے کہ مراد وہ ''هُدٰی'' (ہدایت) ہے جو سب کے درمیان مشترک ہے، اور وہ توحید ہے۔''

حاصل جواب یہ ہے کہ آپ کو جس ''هُدٰی'' (ہدایت) کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے، اس سے مراد عقائد، بالخصوص عقیدۂ توحید ہے، جو تمام انبیاء علیہم السلام کے درمیان مشترک ہے۔ آپ کو شرائع کی پیروی کا حکم نہیں ہے، اس لیے کہ شرائع مختلف ہیں، اس لیے اس آیتِ کریمہ سے شرائع کی پیروی پر استدلال درست نہیں۔

دوسری آیتِ کریمہ سے استدلال کا جواب:

دوسرے استدلال کا امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے حسبِ ذیل عبارت میں جواب دیا ہے:

''ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْکَ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا'' (النحل:۱۲۳) وهٰذا يتمسک به من نسبهٗ إلی إبراهيم - عليه السلام - وتعارضهٗ الآية الأولی. ثم لا حجة فيها إذ قال: ''أَوْحَيْنَا إِلَيْکَ'' (النحل:۱۲۳) فوجب بما أوحی إليه لا بما أوحی إلی غيره وقوله: ''أَنِ اتَّبِعْ'' (النحل:۱۲۳) أي: افعل مثل فعله، وليس معناه کن متبعًا لهٗ وواحدًا من أمته، کيف والملة عبارة عن أصل الدين والتوحيد والتقديس الذی تتفق فيه جميع الشرائع؟ ولذٰلک قال تعالٰی: ''وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ إِبْرَاهِيْمَ إِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ'' (البقرة:۱۳۰) ولا يجوز تسفيه الأنبياء المخالفين لهٗ. ويدل عليه أنهٗ لم يبحث عن ملة إبراهيم، وکيف کان يبحث مع اندراس کتابه وإسناد أخباره؟۔''(۲)

''مخالف کے قول کے مطابق یہ آیتِ کریمہ پچھلے استدلال میں مذکور آیتِ کریمہ سے متعارض ہوگی، اس لیے کہ پہلی والی آیتِ کریمہ میں تمام انبیاء علیہم السلام کی شرائع کی پیروی کا حکم ہے اور دوسری میں صرف شریعتِ ابراہیمیہ کی پیروی کا حکم ہے، جبکہ جمہور کے موقف کے مطابق ''هُدٰی'' اور ''مِلَّة'' دونوں سے مراد توحید اور بنیادی عقائد ہیں، جن میں تمام شرائع متفق ہیں، اور دونوں آیات میں انہی بنیادی متفق علیہ عقائد کی پیروی کا حکم ہے۔ دوسرا یہ کہ ملتِ ابراہیمی کی اتباع سے مراد یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام جیسا طریقہ کار اپنائے۔ یہ معنی نہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کی امت میں سے ایک فرد بن کر ان کی شریعت کی پیروی کریں، ورنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم شریعتِ ابراہیمیہ کے احکام کو تلاش کر کے اس کی پیروی شروع فرماتے، حالانکہ اس کی کوئی دلیل نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا ہو۔ پھر خود اسی آیت میں صراحۃً مذکور ہے: ''ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْکَ''یعنی آپ کی طرف آنے والی وحی کی بنیاد پر آپ ملتِ ابراہیمی کی پیروی کریں، نہ کہ ابراہیم علیہ السلام کی طرف آنے والی وحی کی بنیاد پر، پس اگر آپ نے کچھ احکام میں ملتِ ابراہیمی کی پیروی فرمائی ہے تو اپنی شریعت کی حیثیت سے، نہ کہ ابراہیمی شریعت کی حیثیت سے، اس لیے اس آیتِ کریمہ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ

آپ کو اپنی وحی والی شریعت کی پیروی کا حکم ہے۔''

حاصلِ جواب یہ ہے کہ آیتِ کریمہ اگر ملتِ ابراہیمی کی پیروی کو لازم قرار دینے پر دال ہو، تو ان آیات سے متعارض ہوگی، جن سے مخالف نے پچھلی تمام شرائع کی پیروی لازم ہونے پر استدلال کیا ہے۔ نیز مخالف نے آیتِ کریمہ کا مطلب غلط سمجھا ہے۔

تیسری آیتِ کریمہ سے استدلال کا جواب

''الآية الثالثة: قولهٗ تعالٰی: ''شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا'' (الشوریٰ:۱۳) وھٰذا يتمسک بهٖ من نسبهٗ إلٰی نوح – عليه السلام – وهو فاسد، إذ تعارضه الآيتان السابقتان. ثم الدين عبارة عن أصل التوحيد، وإنما خصص نوحًا بالذكر تشريفًا لهٗ وتخصيصًا، ومتى راجع رسول الله – صلى الله عليه وسلم – تفصيل شرع نوح؟ وكيف أمكن ذٰلک مع أنهٗ أقدم الأنبياء وأشد الشرائع اندراسا؟ كيف وقد قال تعالٰی: ''شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا'' (الشوریٰ:۱۳)فلو قال: ''شرع لنوح ما وصاكم به'' لكان ربما دل هذا على غرضهم، وأما هٰذا فيصرح بضده۔''(۳)

''حاصلِ عبارت یہ ہے کہ مخالف کے قول کے مطابق سورۂ شوریٰ کی آیتِ کریمہ کا پہلی والی دونوں آیات سے تعارض ہوگا، اس لیے کہ سورۂ انعام والی آیت میں تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعت کی پیروی کا حکم ہے اور سورۂ نحل والی آیت میں ابراہیمی شریعت کی پیروی کا حکم ہے اور سورۂ شوریٰ والی آیت میں نوح علیہ السلام کی شریعت کی پیروی کا حکم ہے، جبکہ جمہور کے قول کے مطابق سورۂ شوری والی آیت میں بھی ''الدین'' سے بنیادی عقائد مراد ہیں، جن میں تمام انبیاء کرام علیہم السلام متفق ہیں، اور اس کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔ تیسرا یہ کہ نوح علیہ السلام کی شریعت کے احکام غیر معلوم تھے اور یہ کسی طرح ثابت نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شریعت کی کھوج لگا کر پیروی کا اہتمام کیا ہو۔ اگر یوں کہہ دیا جاتا کہ نوح علیہ السلام کی شریعت وہی تھی، جس کی پیروی کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے، تو شاید کسی حد تک ان کے دعوی پر دلیل ہوتی، جبکہ موجودہ آیتِ کریمہ تو اس دعوی کی ضد پر صراحۃً دال ہے۔''

حاصلِ جواب یہ ہے کہ اس استدلال کی صحت آیاتِ کریمہ کے درمیان وجودِ تعارض کو مستلزم ہے۔ نیز آیتِ کریمہ میں مشروعیتِ دین کی یکسانیت کو بیان کیا گیا ہے، اور دین عقائد کے مجموعہ کا نام ہے، اور فروعات کے مجموعے کا نہیں، اس لیے مخالف کا استدلال بے محل ہے۔

چوتھی آیتِ کریمہ سے استدلال کا جواب

''الآية الرابعة: قولهٗ تعالٰی: ''إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ يَّحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ'' (المائدۃ:۴۴) الآية، وهو أحد الأنبياء فليحكم بها. واستدل بهٰذا من نسبهٗ

إلٰی موسٰی – علیه السلام – وتعارضُ الآیات السابقة. ثم المراد بالنور والهدی أصل التوحید وما یشترک فیه النبیون دون الأحکام المعرضة للنسخ، ثم لعلهٗ أراد النبیین في زمانهٖ دون من بعدهم، ثم هو علی صیغة الخبر لا علی صیغة الأمر فلا حجة فیه ، ثم یجوز أن یکون المراد حکم النبیین بها بأمر ابتدأهم بهٖ اللّٰه تعالٰی وحیًا إلیهم لا بوحي موسٰی – علیه السلام – ۔‘‘(۴)

’’حاصلِ جواب یہ ہے کہ اس آیت سے استدلال میں بھی تمام وہ احتمالات موجود ہیں، جو پچھلی آیات میں تھے، یعنی مخالف کی تشریح کے مطابق اس آیتِ کریمہ کا دیگر تینوں آیاتِ کریمہ سے تعارض ہوگا، اس لیے یہاں بھی مشترکات (عقائد) مراد ہیں، قابلِ نسخ احکام مراد نہیں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ ’’یَحْکُمُ بِهَا النَّبِیُّوْنَ‘‘ سے مراد موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے انبیاء مراد ہوں نہ کہ بعد میں آنے والے۔ مزید برآں! آیت میں خبر ہے، امر نہیں، جیسا کہ یہ احتمال ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام اس شریعت کی پیروی کرتے تھے، لیکن اپنی شریعت کی حیثیت سے، نہ کہ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی حیثیت سے۔‘‘

ان تمام جوابات کا خلاصہ یہ ہوا کہ قرآن مجید کی کسی بھی آیت میں اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پچھلے انبیاء کرام علیہم السلام پر ایمان لانے، ان کی پیروی کرنے، ان کے طریقہ پر چلنے اوران کی طرف نازل ہونے والی وحی کو اپنانے کا حکم دیا گیا ہے، تو اس سے بنیادی عقائد، متفق علیہ مشترکات اور غیر قابل النسخ محکمات مراد ہیں، ورنہ قرآنی آیات میں تعارض کی صورت سامنے آئے گی۔ مزید برآں! اکثر آیاتِ کریمہ صراحۃً اس بات پر دلالت کررہی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس شریعت کی پیروی کے پابند ہیں، جو آپ پر نازل ہوئی ہے۔ پس یہ آیاتِ کریمہ جمہور کے مؤقف کی مؤید ہیں، نہ کہ اس مؤقف کی کہ شرائع میں اصل استمرار و بقاء ہے۔

پہلی حدیث سے استدلال کا جواب

’’قلنا: بل فیه ’’فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ ۔‘‘ (البقرۃ:۱۹۴)

حضرت انس بن النضر رضی اللہ عنہ کی بہن حضرت ربیع رضی اللہ عنہا کے واقعے سے استدلال کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ ایک تو قرآن مجید کی ’’فَمَنِ اعْتَدٰی‘‘ والی آیت کے عموم میں دانت کے قصاص کا حکم شامل ہے۔(۵) دوسرا یہ کہ جب تورات والے احکامِ قصاص کو بغیر کسی نکیر یا تردید کے قرآن مجید میں نقل کردیا گیا تو اب وہی احکام، شریعتِ قرآنیہ وشریعتِ محمدیہ کے احکام بن گئے اور اسی حیثیت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت اس کی پیروی کی پابند ہیں، نہ کہ شریعتِ موسویہ کی حیثیت سے۔

دوسری حدیث سے استدلال کا جواب

’’قلنا: ما ذکرهٗ – صلی اللّٰه علیه وسلم – تعلیلاً للإیجاب، لکن أوجب بما أوحی إلیه ونبه علی أنهم أمروا کما أمر موسٰی وقوله ’’لِذِکْرِیْ‘‘ (طٰہٰ:۱۴)أي:

لذکر إیجابی للصلاة، ولولا الخبر لکان السابق إلی الفهم أنهٗ لذکر اللّٰه تعالٰی بالقلب أو لذکر الصلاة بالإیجاب. ''(۶)

''یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ طٰہٰ کی آیتِ کریمہ کو نماز واجب ہونے کی علت اور وجہ کے طور پر ذکر نہیں فرمایا، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو وحی آئی تھی، اس کے بموجب فرمایا کہ: جب نماز یاد آئے تو اس کو پڑھ لیں۔ آیت نقل کرنے سے اس طرف توجہ دلائی کہ اس اُمت کو نماز کا حکم اس طرح دیا گیا ہے جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا تھا۔''

تیسری حدیث سے استدلال کا جواب

''الحدیث الثالث: مراجعتهٗ – صلی اللّٰه علیه وسلم – التوراةَ فی رجم الیهودیین وکان ذٰلک تکذیبًا لهم فی إنکار الرجم، إذ کان یجب أن یراجع الإنجیل فإنهٗ آخر ما أنزل اللّٰه، فلذٰلک لم یراجع فی واقعة سوی هذهٖ، واللّٰه أعلم۔''(۷)

''حاصلِ جواب یہ ہے کہ رجم کے حکم سے انکار میں یہود کے جھوٹ کو ثابت کرنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تورات منگوانا اگر اس نظریے پر مبنی ہوتا کہ ''شَرَائِعُ مَنْ قَبْلَنَا'' کے احکام کی پیروی ہمارے اوپر لازم ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم انجیل منگوا لیتے، اس لیے کہ ''شَرَائِعُ مَنْ قَبْلَنَا'' میں باعتبارِ نزول آخری کتاب انجیل تھی، نہ کہ تورات۔ مزید برآں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کے علاوہ کسی اور موقع پر تورات نہیں منگوائی، جو اس بات کی دلیل ہے کہ اس موقع پر تورات منگوانا اس نظریے پر مبنی نہیں کہ شرائع میں اصل استمرار ہے۔''

اس واقعہ سے استدلال کا اصل جواب یہ ہے کہ اس وقت جرم زنا کی سزا کا یہودیوں پر اجراء اور تنفیذ مقصود تھی، جو اُن کی شریعت کی روشنی میں کی گئی، مسلمانوں پر سزا کی تنفیذ مقصود نہیں تھی اور نہ کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تورات والی شریعت کے احکام کا مسلمانوں پر اجراء کیا ہے، جبکہ زیرِ بحث مسئلہ یہ ہے کہ کیا ''شَرَائِعُ مَنْ قَبْلَنَا'' مسلمانوں کے لیے اب بھی شریعت ہے؟ یا ہم صرف شریعتِ محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کی پیروی کے پابند ہیں؟ اس لیے اس واقعہ سے زیرِ بحث مسئلہ پر استدلال بے محل ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱:......المستصفی، لأبی حامد محمد بن محمد الغزالی، م: ۵۰۵ھ، ج:۱،ص: ۱۶۵-۱۶۸-۲۴۶۔
۲:......حوالہ مذکورہ، ج:۱،ص: ۱۶۵-۱۶۸۔
۳:......حوالہ مذکورہ، ج:۱،ص: ۱۶۵-۱۶۸۔
۴:......حوالہ مذکورہ، ج:۱،ص: ۱۶۵-۱۶۸۔
۵:......حوالہ مذکورہ، ج:۱،ص: ۲۵۹۔
۶:......حوالہ مذکورہ، ج:۱،ص: ۲۶۰۔
۷:......حوالہ مذکورہ، ج:۱،ص: ۲۶۰۔

(جاری ہے)

حضرت مولانا محمد اسلم قاسمی رحمۃ اللہ علیہ

مفتی محمد صادق حسین قاسمی کریم نگری
مدیر ماہنامہ الاصلاح، وجنرل سیکرٹری جمعیۃ علماء، ضلع کریم نگر، انڈیا

اس اندوہ ناک اور غمگین خبر سے علمی دنیا بالخصوص سوگوار ہوگئی کہ متکلم اسلام، قادر الکلام خطیب، ممتاز سیرت نگار، ادیب وقلم کار، محدث ومفسر، مقبول مدرس، صاحبزادہ حکیم الاسلامؒ حضرت مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی رحمۃ اللہ علیہ بروز پیر بوقت بارہ بجے دن ۱۳/نومبر۲۰۱۷ء کو داغِ مفارقت دے گئے اور اپنی جدائی کے غم سے دنیا کو مغموم کر گئے۔

آپ کی رحلت اور انتقال علمی دنیا کا ایک عظیم خسارہ اور ایک دور کا خاتمہ ہے۔ آپ خانوادۂ قاسمی کے گلِ سرسبد تھے، علومِ قاسمیہ کے امین تھے، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی خطابت وکمالات کے پیکر تھے، فہم وفراست، فکر وتدبر، علم وحلم، تقویٰ وطہارت، تصنیف وخطابت، بلند اخلاق وکردار، سادگی وتواضع، روایاتِ اسلاف کی پاسداری میں اونچا مقام ومرتبہ رکھتے تھے۔ ظاہری شکل وصورت میں وجیہ وپُروقار، خوبصورت ونفاست پسند تھے، خاموش مزاج، لیکن بولتے تو علوم کے دریا بہاتے، حکمت کے موتی لُٹاتے، تحقیق وتدقیق کی باریکیاں پیش فرماتے اور عوام وخواص کو اپنی منفرد خطابت، بے مثال زورِ بیان اور دل نشین اسلوبِ کلام سے مستفید فرماتے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا محمد اسلم صاحب قاسمیؒ کی شخصیت میں گوناگوں خوبیوں اور کمالات کو جمع فرمادیا تھا اور آپ کا تعلق اور رشتہ بھی اس خاندان سے ہے جس نے سرزمینِ ہند میں علوم کی نشر واشاعت اور دین کی بقا وتحفظ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ آپ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے پڑپوتے تھے، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے دوسرے فرزند تھے۔

آپ نے پوری زندگی درس وتدریس، قرآن وسنت کی تعلیم وتشریح میں گزاری اور تقریر وخطابت کے ذریعہ دنیا بھر میں دین کی ترجمانی میں بسر کی۔ مختلف خوبیوں اور خصوصیتوں سے پروردگارِ عالم نے نوازا تھا۔ اس موقع پر آپ کی بہت سی خوبیوں کا تذکرہ کیے بغیر صرف دو خوبیوں: سیرت نگاری

اور خطابت پر مختصر روشنی ڈالتے ہیں، اس سے قبل آپ کا مختصر تعارفی خاکہ ملاحظہ فرمائیں:

آپ کی ولادت ۳/جون ۱۹۳۸ء میں ہوئی۔ از اول تا آخر دارالعلوم دیوبند میں تعلیم وتربیت حاصل کی، ناظرہ قرآن مجید قاری محمد کامل صاحبؒ کے یہاں مکمل کیا، فارسی کا چار سالہ نصاب مولانا بشیر صاحب دیوبندیؒ، مولانا مشفع صاحب دیوبندیؒ، مولانا ظہیر صاحب دیوبندیؒ کے پاس۔ عربی درجات کے اساتذہ میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی صاحبؒ، حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب مرادآبادیؒ، حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی مدظلہٗ، حضرت مولانا نعیم صاحب دیوبندیؒ، حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحبؒ، حضرت مولانا عبدالاحد صاحب دیوبندیؒ قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۹۵۹ء میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی اور ۱۹۶۹ء میں دارالعلوم دیوبند میں تقرر ہوا اور مختلف انتظامی شعبوں سے وابستہ رہے۔ آپ بے مثال خطیب، انفرادی شان کے مدرس، بلند پایہ مصنف، سحر طراز صاحبِ قلم وادیب، بلند فکر شاعر، کثیر المطالعہ قدیم وجدید کے پختہ عالم، گوناگوں صلاحیتوں کے حامل، خاموش طبیعت، متین، پُر وقار اور بردبار، یورپی ممالک میں حکیم الاسلامؒ کے رفیقِ سفر اور حکیمانہ خطاب کے ترجمان، اجلاسِ صد سالہ کے ناظم وروحِ رواں، دارالعلوم وقف دیوبند کے محدث، صدر المدرسین اور ناظمِ مجلسِ تعلیمی۔ (حیاتِ طیب، ج:۱، ص:۲۷۷)

حضرت مولانا محمد اسلم قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کا شمار ممتاز سیرت نگاروں میں ہوتا تھا، سیرتِ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم آپ کا خاص موضوع اور محبوب مشغلہ تھا، سیرتِ پاک لکھنے اور بولنے میں بلاشبہ آپ یگانہ روزگار تھے۔ سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر آپ کی گراں قدر خدمات اور زندہ وتابندہ محنتیں موجود ہیں۔ آپ نے ''مجموعہ سیرتِ پاک'' کے عنوان سے ضخیم کتاب تیار کی، اسی طرح ''سیرتِ پاک'' کے عنوان سے بھی ایک قیمتی کتاب تالیف فرمائی، اور سیرتِ رسول پر نہایت مشہور کتاب ''سیرتِ حلبیہ'' کو آپ ہی نے شستہ اور سلیس اردو میں منتقل کیا۔ آپ کے سیرت النبیؐ سے ذوق وشوق کو بیان کرتے ہوئے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ''سیرتِ حلبیہ'' کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''حق تعالیٰ جزائے عطا فرمائے عزیز برخوردار سعادت آثار مولوی محمد اسلم سلمہٗ قاسمی فاضلِ دیوبند وناظم شعبہ نشر واشاعت وامورِ عامہ دارالعلوم دیوبند کو جنہوں نے ''سیرتِ حلبیہ'' کے بامحاورہ اور سلیس ترجمہ کا بیڑا اُٹھایا اور عملی طور پر شروع کر کے اس کی ایک قسط بھی تیار کر لی۔ عزیز موصوف کو سیرتِ رسول سے چوں کہ پہلے ہی سے خاص لگاؤ اور طبعی مناسبت ہے، چناں چہ وہ اس سے پہلے ''مجموعہ سیرتِ رسول'' کے نام سے اپنی ایک بلیغ اور بلند پایہ تالیف شائع کر چکے ہیں جو مقبولِ عام ہوئی اور بعض بعض تعلیم گاہوں کے نصاب میں بھی قبول کر لی گئی، اس لیے وہی احق تھے کہ ''سیرتِ حلبیہ'' جیسی مستند اور ماخذِ کتبِ ذخیرۂ

سیرت سے ہندوستان کو روشناس کرائیں، انہوں نے اپنے خداداد ملکۂ سیرت نگاری سے اس اہم سیرت کو اس خوبی سے اردو کا جامہ پہنانا شروع کیا ہے کہ وہ اس کے بدن پر چست اور فِٹ نظر آتا ہے، جس میں کہیں جھول نظر نہیں آتا۔'' (سیرتِ حلبیہ، ج:۱،ص:۴۰)

تقریباً چھ ضخیم جلدوں میں ''سیرتِ حلبیہ'' آپ کے ترجمہ کے ساتھ شائع ہوئی اور مقبول بھی۔ حضرت مولانا اسلم صاحبؒ خود اپنی ایک مقبولِ زمانہ کتاب ''سیرتِ پاک'' کے ابتدائیہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''یہ تصور ہی مجھ جیسے بے مایہ انسان کے لیے بڑا صبر آزما تھا کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مقدسہ پر کچھ لکھنے کا ارادہ کروں، لیکن ایک تو اپنے بزرگوں کی حوصلہ افزاء موجودگی کے بھروسہ پر اور دوسرے صرف اس آس پر کہ جس مقدس و معظم ذات صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف میری یہ محنت منسوب ہے، اسی ذاتِ اقدس کے طفیل شاید میرے گناہوں کا کفارہ ہوجائے، بنامِ خدا میں نے ایک نئے سلسلے کی ترتیب کا آغاز کردیا۔ آج میرے لیے زبردست مقامِ مسرت ہے کہ اپنی حسبِ استطاعت ایک طویل محنت و جانفشانی کے بعد یہ سلسلہ مکمل ہوکر کتابت وطباعت کے مراحل سے گزر رہا ہے جو بچوں کے علاوہ کم تعلیم والے لوگوں کے لیے بھی ان شاء اللہ! اسی قدر مفید ثابت ہوگا۔'' (سیرتِ پاک:۸)

ان دو اقتباسات سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں سیرتِ رسول سے انہیں کس درجے شغف تھا اور وہ اس کو سہل اسلوب اور آسان انداز میں عام کرنے اور ہر طبقے کے مزاج ونفسیات کے لحاظ سے پیش کرنے کے لیے فکر مند وکوشاں رہے۔ سیرتِ رسول پر جہاں لکھنے میں انہیں غیر معمولی ملکہ حاصل تھا، وہیں سیرتِ رسول پر بولنے میں کمال درجہ قدرت اور خصوصی امتیاز حاصل تھا۔ راقم الحروف جس وقت دارالعلوم حیدرآباد میں ابتدائی درجات میں زیرِ تعلیم تھا، غالباً ۲۰۰۲ء دارالعلوم حیدرآباد ہی کی جانب سے شہر حیدرآباد کے مشہور آڈیٹوریم میں ''خطباتِ سیرت'' کے عنوان سے سلسلہ وار خطابات کا اہتمام کیا گیا تھا، جس کے لیے دو شخصیتیں بطور مقرر مدعو تھیں، جن میں ایک حضرت مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی صاحب مدظلہٗ اور دوسری شخصیت حضرت مولانا محمد اسلم صاحب قاسمیؒ کی تھی، وہیں سے آپ کی پُروقار شخصیت سے پہلا تعارف ہوا تھا اور آپ کے اندازِ بیان نے حلقۂ ارادت مندوں میں شامل کیا۔ دوسری خوبی کا ذکر اگر چہ ضمن آ یا ہی گیا کہ خطابت اور تقریر میں بھی اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی کمال اور ملکہ عطا کیا تھا۔ آپ کے والد بزرگوار حکیم الاسلامؒ خطابت میں منفرد شان کے مالک تھے اور شہرۂ آفاق بھی، اللہ تعالیٰ نے خطابت کی وراثت آپ کے باکمال فرزندوں میں بھی منتقل فرمائی، جہاں خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی مدظلہٗ نے امتیاز حاصل کیا، وہیں متکلمِ اسلام حضرت مولانا

محمد اسلم صاحبؒ نے بھی اپنی انفرادیت اور عظمت کا لوہا منوایا۔ حضرت مولانا محمد نور عالم خلیل امینی صاحب مدظلہٗ لکھتے ہیں:

''وہ اس وقت ہندوستان کے منتخب واعظین اور خطباء میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اُنہیں عربی، فارسی اور اردو کے ساتھ انگریزی سے بھی واقفیت ہے۔'' (پسِ مرگ زندہ: ۱۷۴، درتذکرہ حکیم الاسلامؒ)

بارعب شخصیت کے ساتھ آواز میں دبدبہ اور کشش بھی تھی۔ سلاست اور روانی، تحقیق اور شگفتہ بیانی ہر کسی کو آپ کا گرویدہ بنادیتی تھی۔ قدیم علوم میں کامل مہارت کے ساتھ جدید فنون سے بھی آپ باخبر تھے، حالات اور تقاضوں کا ادراک کرنے اور بروقت مناسب ومفید اظہارِ خیال میں منفرد تھے۔ نئے دور کے چیلنجز کا مقابلہ کرنے، اور رفتارِ زمانہ کے ساتھ دعوتِ دین کے مشن کو آگے بڑھانے کی ترغیب دینے اور طالبانِ علومِ نبوت کو اپنے بلند مقام ومنصب سے آگاہ کرنے میں آپ کی انوکھی شان تھی۔

حضرت مولاناؒ کی علالت اور بیماری کی خبریں وقتاً فوقتاً سننے اور پڑھنے کو ملتی تھیں اور حسبِ توفیق دعائے صحت کا اہتمام بھی کیا جاتا رہا، لیکن انتقال پُرملال کی خبر صاعقہ اثر نے ایک عظیم شخصیت سے محرومی کے احساس سے مغموم کردیا ہے، بلکہ علم سے رشتہ رکھنے والا ہر انسان اس عظیم المرتبت شخصیت کے سانحۂ ارتحال سے رنجیدہ ہے، مدتوں بعد ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں اور یادگار نقوش صفحۂ ہستی پر ثبت کرجاتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہر انسان حیاتِ مستعار کی مدت پوری کرکے ایک نہ ایک دن ضرور رختِ سفر باندھ کر حیاتِ جاوداں کی طرف کوچ کرجائے گا، لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جن کا وجود بھی ہمت اور حوصلہ اور تقویت وبرکت کا باعث ہوتا تھا، چناں چہ حضرت مولانا محمد اسلم صاحبؒ بھی ان ہی چند شخصیات میں سے تھے، جن کی موجودگی کے احساس سے ہی دل وجان کو اطمینان نصیب ہوتا تھا۔ آج جب کہ حضرت مولاناؒ ہمارے درمیان نہیں رہے، لیکن آپ کی فکریں اور محنتوں کا پورا نقشہ موجود ہے، جس کو فراموش کیے بغیر کام کرتے رہنا ہی کامیابی کی کلید ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولاناؒ کو غریقِ رحمت فرمائے، آپ کی خدماتِ جلیلہ کو قبول فرمائے، ان کو صدقہ جاریہ بنائے اور آپ کے فیض کو جاری وساری رکھے۔ آمین

دریافت کی ہے میں نے وہ منزل کہ دوستو
ڈھونڈیں گے میرے بعد بہت کارواں مجھے

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

قربانی، عقیقہ اور صدقہ کے جانوروں میں فرق!

ادارہ

کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ:

مختلف فلاحی اداروں میں صدقے کے بکرے کے سلسلے میں جاتا ہوں، لیکن ایک چیز جو مجھے پریشان کرتی ہے اور دل گرفتہ بھی، وہ یہ کہ جو جانور صدقے یا عقیقے کے مقصد کے لیے لائے جاتے ہیں وہ کسی طور پر بھی اس قابل نہیں ہوتے کہ ان کو صدقہ یا عقیقے کے لیے استعمال میں لایا جاسکے۔ ایک تو یہ انتہائی کم عمر ہوتے ہیں، یا یوں کہیئے کہ جسامت میں بچے اور انتہائی کمزور ہوتے ہیں اور معذرت کے ساتھ جو رقم ان اداروں میں اس مد میں لی جاتی ہے اس کے عوض جو جانور پیش کیے جاتے ہیں، وہ کسی بھی طرح اس رقم سے مطابقت نہیں رکھتے۔ اور چھری چلاتے وقت اس بات کا بھی دل میں اندیشہ سا رہتا ہے کہ ہم (نعوذ باللہ!) ان بچوں پہ چھری چلاتے ہوئے گناہ کے مرتکب تو نہیں ہورہے؟! مسئلہ پیسوں کا نہیں ہے، بلکہ انسانی صحت کا بھی ہے، یقیناً جو گوشت یہاں پر جمع ہوتا ہے، وہ ایسے لوگوں کو ہی دیا جاتا ہوگا جو حقیقۃً اس کے مستحق ہیں، جبکہ اتنے کمزور یا یوں کہیئے کہ کم عمر جانور کی قربانی اسلام میں بھی سختی سے منع ہے، بلکہ اس کا گوشت بھی سائنسی بنیادوں پر انسانی صحت کے لیے انتہائی مضر ہے اور صدقہ کا تو مقصد ہی بہت عظیم ہے، لیکن اس طرح ہم اللہ کی رضا حاصل کرنے کے بجائے اس کی ناراضگی تو مول نہیں لے رہے؟! اس سلسلے میں مجھ ناچیز کو آپ سے درج ذیل اُمور پہ قرآن وسنت کی روشنی میں رہنمائی درکار ہے۔

۱:...... جو جانور صدقے یا عقیقے کے مقصد سے فروخت کیے جائیں ان کی کم از کم عمر کیا ہونی چاہیے؟

۲:...... جانوروں کی قیمت کا تعین کیا ان کی نسل سے ہونا چاہیے یا صحت سے؟

۳:...... جانوروں کی ویکسینیشن کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا صدقے یا عقیقے کے جانوروں

میں کسی قسم کی تفریق جائز ہے؟ اگر کوئی ادارہ یا فرد اس سلسلے میں کوئی تفریق کرتا ہے تو اس سلسلے میں جانور خریدنے اور بیچنے والا دونوں کے بارے میں کیا احکامات ہیں؟

۴:......اگر کوئی شخص یا ادارہ جانور کی عمر یا صحت کے سلسلے میں خریدار سے غلط بیانی کرتا ہے، جب کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے، اس کا علم خریدار کو جانور کٹنے اور اس کے گوشت کی تقسیم کے بعد ہوتا ہے تو کیا اس کا گناہ جانور فروخت کرنے والے پر واجب ہوگا یا خریدار پر بھی؟

جناب عالی! میری دانست میں جو سوالات تھے، میں نے بیان کردیئے، اب آپ سے قرآن وسنت کی روشنی میں رہنمائی چاہتا ہوں۔ مستفتی: محمد شفیق احمد ولد محمد دستگیر مرحوم، کراچی

الجواب حامدًا ومصليًا

ا:......واضح رہے کہ قربانی کے جانوروں کے لیے شرعاً عمر مقرر ہے کہ اتنی عمر کا جانور ہو تو اس کی قربانی جائز ہے، ورنہ قربانی نہیں ہوگی، چنانچہ بکری، بکرے، دنبہ اور بھیڑ کے لیے کم از کم ایک سال کی عمر کا ہونا ضروری ہے۔(والتفصيل فی الفقه)البتہ اگر دنبہ، بھیڑ پورے سال کا نہ ہو، لیکن اتنا توانا اور صحت مند ہو کہ سال بھر کے دنبہ اور بھیڑوں کے ساتھ کھڑا کیا جائے تو یہ ان سے چھوٹا نظر نہ آئے تو اس کی قربانی بھی جائز ہے۔اسی طرح جانور عیب دار نہ ہو، جس کی تفصیلات کتابوں میں مذکور ہیں، جب کہ صدقہ کے جانور میں عمر کی کوئی قید نہیں ہوتی، بلکہ صدقہ کرنے والا جتنی مالیت کا جانور اللہ کے راستہ میں صدقہ کرنا چاہے کرسکتا ہے اور وہ جتنی مالیت صدقہ کرے گا اتنی مالیت کا اُسے اجروثواب ملے گا۔البحرالرائق میں ہے:

’’وجاز الثني من الكل والجذع من الضأن ، لقوله عليه الصلاة والسلام: لاتذبحوا إلامسنة، إلا أن يعسر عليكم فتذبحوا جذعة من الضأن ...... والثنی من الضأن والمعز ابن مسنة۔‘‘ (البحرالرائق، کتاب الأضحیۃ، ج:۷،ص:۱۷۷، ط:رشیدیہ)

المحیط البرہانی میں ہے:

’’والثنی من الغنم الذی تم علیه السنة وطعن فی الثانیة۔‘‘(ج:۲،ص:۹۲، ط:ادارۃ القرآن)

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

’’حتی لو ضحّٰی بأقل من ذٰلک شیئًا لایجوز ، ولو ضحّٰی بأکثر من ذٰلک شیئًا یجوز ویکون أفضل۔‘‘ (ج:۵،ص:۲۹۷، ط:ماجدیہ)

عمر کی تعیین کے بعد قربانی کے جانوروں کے انتخاب میں ایسے جانور کا انتخاب کرنا مستحب ہے جو بڑے جسم کا، دیکھنے میں خوبصورت، فربہ اور گوشت سے بھرا ہوا ہو، اور دام میں مہنگا اور گوشت میں زیادہ ہو، تاہم قربانی کی شرائط جانور میں پائے جانے کی صورت میں جس مالیت کا بھی جانور لے، کوئی حرج نہیں۔بدائع الصنائع میں ہے:

’’وأما الذی یرجع إلی الأضحیة فالمستحب أن یکون أسمنَها وأحسنَها

وأعظمَها ، لأنها مطية الآخرة۔‘‘ (بدائع الصنائع ، ج:۵،ص:۸۰، ط:سعید)

اور جو جانور بالکل لاغر ہو اور خود نہ چل سکتا ہو یا اندھا ہو کہ دیکھ نہ سکتا ہو یا ایسا بیمار ہو کہ اس کے صحیح ہونے کی اُمید نہ ہو یا اُس میں کوئی ایسا شرعی عیب ہو جو قربانی کی صحت کے لیے مانع ہو تو ایسے جانوروں کی قربانی جائز ہی نہیں۔البحرالرائق میں ہے:

’’(لا بالعمياء والعوراء والعجفاء والعرجاء) أی التی لاتمشی إلی المنسک أی المذبح ، لما روي عن البراء بن عازبؓ أنهٗ عليه السلام قال: ’’أربع لاتجوز فی الأضاحی : العوراء البين عورها ، والمريضة البين مرضها ، والعجفاء البين ضلعها ، والكسيرة التی لاتنقی۔‘‘ (البحرالرائق، ج:۸،ص:۱۷۶، ط:سعید)

المحیط البرہانی میں ہے:

’’ولابأس بالمهزولة إذا بقی لها بعض اللحم، فإن لم يبق شيئًا من ذٰلک لايجوز۔‘‘ (ج:۶،ص:۹۳)

عقیقہ کے لیے بھی وہی جانور معتبر ہیں جن کی قربانی جائز ہو،اس لیےان کا بھی یہی حکم ہے،لہٰذا جو جانور عقیقہ یا قربانی کے لیےخریدے جائیں توان کا قربانی کی عمر کا ہونا ضروری ہے۔الدرالمختار میں ہے:

’’ثم يعق عند الحلق عقيقة .... وهی شاة تصلح للأضحية۔‘‘

(الدرالمختار مع شرحہ ردالمحتار، ج:۶،ص:۳۳۶، ط:سعید)

۲:......قربانی وغیرہ کے جانوروں کی قیمت کا تعین ان کی نسل سے ہونا ضروری نہیں ہے، بلکہ ان میں مطلوبہ شرائط کا پایا جانا کافی ہے اور جسامت میں عمدگی مستحب ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک حصہ کی قربانی کے لیے اگر پچاس ہزار روپے میں ایک عمدہ گائے میسر ہوسکتی ہو تو اتنی مالیت کے اعلیٰ نسل کے بکرے، بکری کے مقابلے میں یہ گائے خریدنا بہتر اور مستحب ہوگا ، بوجہ گوشت کی زیادتی اور غرباء کے نفع کے اور اگر اسی قیمت میں فربہ اور گوشت سے پُر بکری مل سکتی ہو تو لاغر اعلیٰ نسل کے بکرے کے مقابلے میں اس کو خریدنا زیادہ اولیٰ اور باعثِ ثواب ہوگا۔المحیط البرہانی میں ہے:

’’البقرة أفضل من الشاة فی الأضحية إذا استويا فی القيمة ...... والأصل فی هٰذا أنهما إذا استويا فی اللحم والقيمة فأطيبها لحماً أفضل وإذا اختلفا فی القيمة واللحم فالفاضل أولٰی . إذا ثبت هٰذا فنقول: العجل بعشرين وذٰلک قيمتهٗ أفضل من خصی بخمسة عشر و إن كان الخصی أطيب لحما لأن الآخر أكثر۔‘‘ (المحیط البرہانی، ج:۶،ص:۹۳، ط:ادارۃ القرآن)

۳:......جب قربانی اور عقیقہ کے جانور میں عمر کی شرط ہے، عیوب سے پاک ہونا لازم ہے اور صدقہ میں یہ پابندی نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ دونوں کے درمیان واضح فرق ہے اور جو دونوں کے درمیان فرق کرے وہ درست ہے۔ چونکہ صدقہ کرنے سے غریبوں کی امداد اور ان کے ساتھ تعاون

کر کے اللہ کی خوشنودی مقصود ہونی چاہیے، اس لیے جس سے غرباء کا تعاون زیادہ ہوگا اس میں اجر زیادہ ہوگا۔ بعض لوگ صرف خون بہانے کو صدقہ میں زیادہ اہمیت دیتے ہیں، خواہ مالیت کم ہی کیوں نہ ہو، یہ اُن کی غلط فہمی ہے، بلکہ کثرتِ اجروثواب کا مدار کثرتِ مالیت اور اخلاص پر ہے۔

۴:......اگر کوئی نمائندہ غلط بیانی کرتے ہوئے کم قیمت میں خرید کردہ جانور زیادہ قیمت ظاہر کر کے صدقہ دینے والے یا قربانی کرنے والے سے زیادہ رقم وصول کرے تو یہ خیانت ہے، جو کہ حرام ہے، اس کا گناہ خیانت کرنے والے کی گردن پر ہوگا، ہاں! اگر صدقہ یا قربانی کرنے والے کو پہلے سے اس کا علم یا اندازہ ہو تو اُسے چاہیے کہ ایسے ادارے کو وکیل نہ بنائے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

۱-''الوكيل بالشراء إذا وجد بالمشتریٰ عيبًا ورضی به وقبضهٗ ، فإن كان العيب ليس باستهلاک، مثل العمی وغيرہٖ لزم الأمر وإن كان استهلاكاً مما لايتغابن الناس فی مثلهٖ لم يلزم الأمر وكان الأمر أن يلزم المشتری ۔'' (الفتاویٰ الہندیۃ، ج:۳،ص:۵۸۵، ط: ماجدیہ)

۲-''وأما حكمها: منه قيام الوكيل مقام الموكل فيما وكلهٗ بهٖ ولايجبر الوكيل فی اتيان ما وكل بهٖ إلا فی دفع الوديعة......'' (الفتاوی الہندیۃ، ج:۳،ص:۵۶۶، ط: ماجدیہ)

۳-''ومنه أنهٗ أمين فيما فی يدهٖ كالمودع فيضمن بما يضمن بهٖ المودَع ويبرأ بهٖ ۔'' (الفتاوی الہندیۃ، ج:۳،ص:۵۶۷، ط: ماجدیہ)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح	کتبہٗ
ابوبکر سعید الرحمٰن	محمد انعام الحق	محمد عبدالقادر	محمد نیاز (رحمۃ اللہ علیہ)

دارالافتاء جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

ماہ نامہ ''بینات'' کی خصوصی اشاعتیں

①	حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ	400/= روپے
②	حضرت مولانا مفتی احمد الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ	500/= روپے
③	حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمۃ اللہ علیہ	400/= روپے
④	حضرت مفتی محمد جمیل خان شہید رحمۃ اللہ علیہ	400/= روپے
⑤	حضرت مولانا سعید احمد جلال پوری شہید رحمۃ اللہ علیہ	350/= روپے
⑥	حضرت مولانا عطاء الرحمٰن شہید رحمۃ اللہ علیہ	100/= روپے
⑦	حضرت مفتی عبدالمجید دین پوری شہید رحمۃ اللہ علیہ	100/= روپے

نَقدُ و نَظَر

ادارہ

یادگار خطوط

مرتب: ڈاکٹر عبدالشکور عظیم۔ صفحات: ۸۰۲۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: مسجد الفرقان، ملیر کینٹ بازار، کراچی۔

مکتوب یا خط' ترسیل و ابلاغ کا ایک ذریعہ ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے خط کو ''دلی خیالات و جذبات کا روزنامچہ اور اسرارِ حیات کا صحیفہ'' قرار دیا ہے۔ خط لکھنے کی روایت زمانۂ قدیم سے چلی آرہی ہے، قرآن کریم میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف سے ملکۂ سبا کو لکھے گئے خط کا تذکرہ موجود ہے۔ خط متعدد اقسام کے ہوتے ہیں: نجی، سیاسی، دفتری، کاروباری، علمی، اصلاحی، وغیرہ۔ علماء، صوفیاء، اُدباء، شعراء کے خطوط میں علم و ادب و معرفت کے مختلف موضوعات سمٹ آتے ہیں جن سے صرف مکتوب الیہ ہی نہیں، بلکہ ذوق وشوق رکھنے والا عام قاری بھی لطف لیتا اور مستفید ہوتا ہے۔ راغب مرادآبادی کا شعر ہے:

دل دادہ کتابوں کے ہیں جو صاحبِ ذوق
پڑھتے ہیں خطوط اہلِ دانش کے بشوق

اکابرین اور بزرگوں کے خطوط و مکاتیب علوم و معارف کا ایک خزینہ ہوتے ہیں، جن کی افادیت اور نفع کسی مجموعہ میں چھپنے سے پہلے مکتوب الیہ تک محدود اور منحصر ہوتا ہے، ان کو جمع و ترتیب دے کر شائع کر دیا جائے تو ان کا نفع عام ہو جاتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے لے کر موجودہ دور تک کے کئی علماء اور بزرگوں اور مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے نامی گرامی اشخاص کے خطوط و مکاتیب کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب جناب ڈاکٹر حافظ قاری فیوض الرحمٰن مدظلہٗ کے خطوط و مکاتیب کا مجموعہ ہے۔ ماشاء اللہ! موصوف ایک معروف علمی شخصیت ہیں، تصنیف و تالیف آپ کا اوڑھنا بچھونا ہے، حضرت کے مختلف شخصیات کو لکھے گئے خطوط بھی بلا شبہ مذکورہ بالا خصوصیات کے حامل ہیں، ان کے جمع کرنے کی سعادت جناب ڈاکٹر عبدالشکور عظیم صاحب حفظہٗ اللہ کو حاصل ہوئی ہے۔ مجموعہ کے شروع میں ڈاکٹر حافظ قاری فیوض

الرحمٰن مدظلہٗ کی مختصر خود نوشت سوانح بھی ہے۔ کتاب کا ٹائٹل خوبصورت، جلد مضبوط اور کاغذ اعلیٰ ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان خطوط و مکاتیب سے قارئین کو نفع اُٹھانے اور کچھ سیکھنے کی توفیق عطا فرمائے اور صاحبِ مکاتیب اور جامع و مرتب کو جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔

دعوتی خطبات

جمع وترتیب: مولانا سید محمد زین العابدین۔ صفحات: ۳۲۸۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: مکتبۃ الایمان، کراچی۔

زیرِنظر کتاب میں تبلیغی جماعت سے منسلک اکابر علماء اور بزرگوں کے اہم دعوتی خطبات کو جمع اور مرتَّب کیا گیا ہے۔ خطبات اصلاحی اور علمی ہونے کے ساتھ ساتھ بنیادی طور پر دعوت وتبلیغ کی ترغیب وتحریص اور اُس کے اصول وآداب پر مشتمل ہیں۔ فاضل مرتب نے کافی محنت سے ان خطبات کو مختلف ذرائع (ای میل، ریکارڈنگ اور کتب ورسائل) سے حاصل کر کے اُنہیں ضروری حک واضافہ کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔ ان خطبات کو تحریری اُسلوب میں ڈھالنے کے لیے تقریر وتحریر کے جداگانہ انداز کو سامنے رکھتے ہوئے ناگزیر مقامات پر تقدیم وتاخیر اور ترمیم کے ساتھ ساتھ عنوانات وحوالہ جات کے اضافہ کی محنت بھی کی گئی ہے، مگر ایسی تبدیلی یا اضافہ سے گریز کیا گیا ہے جس سے ان اکابر کی بات کا مفہوم ہی بدل جائے۔ عام قارئین کے لیے بالعموم اور دعوت وتبلیغ کا کام کرنے والوں اور جماعت میں وقت لگانے والوں کے لیے بالخصوص ان بیانات میں ایمانی، دعوتی اور اصلاحی رہنمائی اور دعوت کے موضوع پر مواد کا کافی ذخیرہ ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا موصوف کی اس مرتب کردہ کتاب کو قارئین کے لیے مفید بنائے، ان کی محنت کو قبول فرمائے۔ بزرگوں کے ان بیانات وملفوظات کا افادہ عام فرمائے، آمین۔

یادگارِ اکابر: الفرقان (بریلی) کا شاہ ولی اللہؒ نمبر (عکسی اشاعت)

مرتب: مولانا محمد منظور نعمانیؒ۔ صفحات: ۴۳۴۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: مکتبہ رشیدیہ، کراچی

زیرِتبصرہ کتاب انڈیا سے شائع ہونے والے مشہور ومعروف رسالے الفرقان (بریلی) کا شاہ ولی اللہؒ نمبر ہے، جس کا عکس لے کر مکتبہ رشیدیہ، اردو بازار کراچی کے ذمہ داران نے یادگارِ اکابر کے کتابی سلسلہ نمبر: ۴ کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ الفرقان (بریلی) کا یہ نمبر ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا، جو اُس وقت ہاتھوں ہاتھ نکل گیا تھا اور لائبریریوں میں بمشکل ملتا تھا۔ مولانا تنویر احمد شریفی صاحب کو اللہ جزائے خیر دے کہ انہوں نے ''یادگارِ اکابر'' کے عنوان سے ایک مجلّہ کا اجراء کر کے کئی بزرگوں کی سوانح وتذکرہ پر مشتمل بڑی بڑی کتب شائع کی ہیں، اور اب یہ عظیم علمی ذخیرہ بھی دوبارہ منظرِ عام پر لے آئے ہیں۔ کتاب کا کاغذ متوسط، ٹائٹل خوبصورت اور جلد بندی مضبوط ہے۔